1

عرض احوال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حذر اے چیرہ دستاں ......!

ہمارے حکمران نائن الیون کے بعد امریکی مطالبات کے آگے گھٹنے ٹیکنے اور ان کی ایک دھمکی پر ہر طرح کا یوٹرن لینے کا جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو افغانستان کی طرح پاکستان کا بھی تورا بورا ہو جاتا' لیکن کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ امریکہ کی خوشنودی کی خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دینے کے بعد بھی آج ہماری کشمیر کاز' ہماری دینی اقدار' ہمارا نصابِ تعلیم' ملکی داخلی امن وامان اور ہماری معیشت تورا بورا ہونے سے محفوظ نہیں رہ سکی؟ پہلے ہمیں صرف اپنی مشرقی سرحد یعنی بھارت کی جانب سے جارحیت کا خوف تھا' لیکن اب ہماری شمال مغربی سرحد بھی خطرات سے خالی نہیں۔ افغانستان میں حامد کرزئی کی کٹھ پتلی حکومت جو پاکستان کے ''بھرپور تعاون'' کے نتیجے میں قائم ہوئی' آج ہر معاملے میں بھارت اور امریکہ کی ہم نوا ہے اور پاکستان کو دونوں اطراف سے شکنجے میں کسنے کے عمل میں نہایت گھناؤنا کردار ادا کر رہی ہے۔ یہی نہیں' بلوچستان میں جو تخریبی کارروائیاں ہو رہی ہیں اور پاکستان کے خلاف سازشوں کے جو جال بُنے جا رہے ہیں اُس میں بھی یہی ٹرائیکا جس کا سرخیل امریکہ ہے' سرگرمِ عمل ہے۔ گویا ؎

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی!

سورۃ التغابن کی آیات ۸ تا ۱۱ کا سبق یہ ہے کہ حقیقی ایمان کا حاصل اور ثمر تسلیم ورضا ہے کہ اللہ پر پوری طرح توکل کیا جائے' اور یہ کہ مستقبل کے اندیشوں کے باعث باطل قوتوں کے آگے سر جھکانے کی بجائے حق وصداقت اور عدل وانصاف پر ڈٹ جانا بندۂ مؤمن کا شعار ہے۔ مؤمن چونکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاکم مطلق اور مُسبب الاسباب مانتا ہے' اس لیے دنیا میں کسی ناکامی یا خطرات کی صورت میں بھی وہ قلبی اطمینان اور دلی سکون کی دولت سے محروم نہیں ہوتا۔ تسلیم ورضا کا یہ مقام اُسی وقت حاصل ہوتا ہے جب اللہ پر گہرا ایمان ویقین حاصل ہو جائے اور ہر خیر اور شر کو مِن جانب اللہ تصور کیا جائے۔ جبکہ موجودہ ملکی صورتِ حال

اس کے برعکس ہے۔ ہمارے حکمران اللہ کو بھول کر ظاہری اسباب و وسائل ہی کو اصل اہمیت دیتے ہیں اور اس اعتبار سے انہیں امریکہ ہی سب سے بڑا اور سب سے زیادہ طاقتور نظر آتا ہے لہٰذا تمام اسباب کا سلسلہ امریکہ سے جوڑتے ہیں' جس کے نتیجے میں چاروناچار اسی فرعونِ وقت کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔

بُتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

لیکن وہ بُت جس کے ساتھ ہم نے عہدِ وفا باندھا تھا' اس کی جانب سے بار بار کی بے وفائی اور طوطا چشمی نے آج ہمارے حکمرانوں کی زندگی عذاب بنا دی ہے۔ بُتوں سے امیدیں وابستہ کرنے اور اللہ سے نومیدی کا یہ نتیجہ تو نکلنا ہی تھا۔ آج حق و باطل کے معاملات گڈمڈ نہیں رہے' بلکہ صاف اور واضح طور پر نظر آ رہا ہے کہ کم و بیش ہمارے تمام ملکی معاملات میں کس کے ایجنڈے کو مکمل کیا جا رہا ہے اور کون ہمیں ڈکٹیٹ کر رہا ہے! اہل درد اس صورتِ حال پر کرب و الم کا شکار ہیں' لیکن ہمارے قومی جرائم کا یہ نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ بحیثیتِ قوم آج ہم امریکہ کے غلام اور محکوم بن چکے ہیں اور اپنے دین و ایمان کا بھی سودا کر چکے ہیں۔ کاش کہ ہم اب بھی جاگ جائیں اور اس حقیقت کا ادراک کر سکیں کہ ہم اپنے اس طرزِ عمل سے دُنیا ہی نہیں آخرت کی بربادی کا بھی سامان کر رہے ہیں۔ اعاذنا اللّٰہ من ذلك!

حقیقت واَقسامِ شرک (۶)

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

(آخری قسط)

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعد:

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِہٖ وَھُوَ یَعِظُہٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ ؔ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾﴾ (لقمٰن) ...... صدق اللّٰہ العظیم

''اور یاد کرو جب کہ لقمان نے کہا اپنے بیٹے سے' اور وہ اسے نصیحت کر رہے تھے' کہ اے میرے بچے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کیجیو۔ یقیناً شرک بہت بڑا ظلم (اور بہت بڑی ناانصافی) ہے''۔

چند ضروری وضاحتیں

''حقیقت واقسامِ شرک'' کے اِس مفصل سلسلۂ گفتگو کے تحت گزشتہ نشست میں ہم نے شرک کی معین کردہ اقسام میں سے تیسری اور آخری قسم ''شرک فی الحقوق'' یا بالفاظِ دیگر ''شرک فی العبادت'' پر گفتگو کی تھی اور ''عبادت'' کے دو اجزائے ترکیبی ''اطاعت'' اور ''محبت'' کے حوالے سے مَیں نے اصولی اور بنیادی باتیں بیان کر دی تھیں۔ اِس ضمن میں انفرادیت سے لے کر اجتماعیت کی بلندترین چوٹی یعنی ''ریاست'' کی الگ الگ مثالیں بیان کرنے کے بعد عرض کیا گیا تھا کہ انہی پر قیاس کرتے ہوئے درمیانی خلاء کو آپ خود پُر کر لیجیے۔ لیکن حاضرین کی جانب سے بعض سوالات کی بنا پر

میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اس موضوع پر بعض باتوں کی مزید وضاحت ضروری اور سودمند ہے۔

کیا تقلید شرک ہے؟

اطاعت کے ضمن میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ قرآن مجید نے اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ: ﴿اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ: ۳۱) اور اس ضمن میں حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کے سوال کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے اس کی جو تشریح فرمائی تھی وہ بھی بیان کی جا چکی ہے۔ اب اسی کو سامنے رکھ کر ہمارے ہاں جو تقلید کا ایک تصور ہے اس کو سمجھ لیجیے!

دیکھئے تقلید کا ایک تصور ہے ''عوام'' کے نزدیک اور ایک تصور ہے ''اہلِ علم'' کے نزدیک۔ اِن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ عوام کے ذہنوں میں تقلید کا جو تصور ہے وہ بالعموم شرک ہے۔ اگر کسی کے ذہن میں یہ بات ہے کہ جو بات امام ابوحنیفہؒ کہہ دیں وہ ہم لازماً مانیں گے، بغیر کوئی دلیل طلب کیے کہ وہ کس بنیاد پر یہ بات کہہ رہے ہیں اور کتاب و سنت کی کون سی دلیل اُن کے پاس ہے، تو یہ شرک ہے۔ اسی طرح اگر کوئی بات مجرد اس لیے مان لی جائے کہ یہ امام احمد بن حنبل یا امام شافعی یا امام مالک رحمہم اللہ کی زبانِ مبارک سے نکلی ہوئی بات ہے تو یہ بلا شک و شبہ شرک ہے۔ البتہ ہمارے ہاں اہل علم کے نزدیک تقلید کا تصور یہ ہے کہ جن عظیم اور باہمت لوگوں نے کتاب و سنت کا فہم حاصل کرنے کے لیے اپنی پوری پوری زندگیاں کھپائی ہیں اُن کے فہم پر اعتماد کرتے ہوئے، اور انہوں نے کتاب و سنت سے استنباط کر کے جو دلائل پیش کیے ہیں ان کو مدّ نظر رکھ کر اُن کی رائے پر عمل کیا جائے۔ اس ضمن میں امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول موجود ہے کہ ''اگر تمہیں میرے کسی قول کے خلاف صحیح حدیث نبویؐ مل جائے تو میری بات کو دیوار پر دے مارو''۔ اس لیے کہ کسی بات میں وزن محض اس وجہ سے ہرگز نہیں ہے کہ یہ فلاں شخص کی بات ہے، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اُس نے کتاب و سنت سے اپنی بات کو مدلل کیا ہے اور کتاب و سنت کے منشاء کو سمجھ کر اس سے استنباط کیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کے اوّلین شاگردوں قاضی ابویوسفؒ اور امام محمدؒ نے اپنے استاد امام ابوحنیفہؒ سے اختلاف کیا ہے اور آج دنیا میں جو فقہ حنفی موجود ہے وہ اکثر و بیشتر امام ابوحنیفہؒ کی رائے پر نہیں ہے بلکہ صاحبین یعنی قاضی ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کی رائے پر ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ''مزارعت'' مطلقاً حرام ہے' لیکن فقہ حنفی میں اس پر جو فتویٰ ہے وہ امام ابوحنیفہؒ کی رائے پر نہیں ہے بلکہ صاحبین کی رائے پر ہے۔ تو اُن کے شاگردوں نے اُن سے اختلاف کیا ہے۔ ہمارے ہاں جب تک تقلید کے معاملے میں یہی طرزِ عمل رہا تو ایک صحت مند فضا رہی۔ اس کے بعد ایک دَور آیا کہ علماء نے اس خطرے کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ اب علم کی کمی ہوگئی ہے' حرص و ہوا کا زور ہوگیا ہے جس کی وجہ سے اجتہاد میں خطرات زیادہ ہیں' یہ کہا کہ اب نئے اجتہاد کی بجائے علماءِ سلف کے اجتہاد پر ہی عمل کیا جائے۔ تو یہ ایک احتیاط ہے جو اِس دَور میں علماء نے اختیار کی ہے۔ لیکن اس میں بھی اہل علم کے نزدیک کوئی شخص اپنی ذات میں مُطاع ہرگز نہیں ہے' بلکہ کتاب و سنت کی بنیاد پر ہی اس کی بات مانی جائے گی۔ چنانچہ یہ تقلید شرک نہیں ہے۔ البتہ اگر کسی شخص کو اپنی ذات میں مُطاع مان لیا جائے تو اس قسم کی تقلید شرک ہے اور یہ اُسی قسم کا شرک ہے جیسا کہ قرآن مجید نے اہل کتاب کے بارے میں کہا کہ:

﴿اِتَّخَذُوۡۤا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ﴾(التوبۃ: ۳۱)

''انہوں نے (یعنی یہود و نصاریٰ نے) اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور صوفیوں کو ربّ بنا لیا''۔

اس لیے کہ دو ہی طبقے مذہبی ہوتے ہیں' علماء اور صوفیاء۔ ہمارے ہاں بھی تصوف کے میدان میں یہ گمراہ کن تصور موجود ہے کہ مرشد کو اپنی ذات میں مُطاع مان لیا گیا ہے۔ اس میدان میں شاعری کے ذریعے بہت فتور اور گمراہی پھیلی ہے اور اس طرح کی باتیں زبان زدِ عوام و خواص ہوگئی ہیں کہ ع ''بہ مَے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید!'' یعنی ''اگر تمہارا مرشد تم سے کہے کہ تم اپنی جانماز کو شراب سے رنگین کر دو تو

کر دیا کرو"۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ یہ تصور خالص شرک ہے۔کوئی چاہے مرشد ہو' عالم ہو' حاکم ہو' مجتہد ہو' کسی کی بات بھی اگر مانی جائے گی تو کتاب وسنت کے دائرے کے اندر اندر مانی جائے گی اور قرآن وحدیث کی دلیل سے مانی جائے گی ۔اگر طرزِعمل یہی ہے تو یہ توحید ہے۔اور اگر اس کوکہیں سے بھی اور کسی پہلو سے بھی مجروح کر دیا جائے تو یہ شرک ہے۔

محبت اور پرستش میں فرق

اب آیئے "محبت" کے معاملے میں جو عملی پہلو ہیں اُن پر غور کر لیا جائے۔ جان لیجیے کہ "محبت" اور چیز ہے اور "پرستش" اور چیز ہے۔[1] ایسے ہی وطن کی محبت اور چیز ہے اور وطن پرستی اور چیز ہے۔ وطن سے محبت اپنی جگہ ایک مطلوب اور قابلِ قدر جذبہ ہے۔ جسے وطن سے محبت نہ ہو وہ شخص بڑا بے غیرت ہے۔ جسے والدین سے محبت نہ ہو تو وہ شخص بڑا بے حمیت ہے۔ اپنے قبیلے اور قوم سے محبت نہ ہو تو ایسا شخص بے غیرت اور بے حمیت ہے۔اب اگر یہ تمام محبتیں اللہ کی محبت کے تابع رہیں اور اللہ کی محبت ان سب کے اوپر ہو تو یہ "توحید فی المحبت" ہے۔اس کے برعکس اگر ایک محبت بھی اللہ کی محبت سے بالاتر ہو جائے یا برابر بھی ہو جائے تو وہ "شرک فی المحبت" ہے۔

اسی طرح سے ایک اور پرستش ہے "شخصیت پرستی"۔ یہ بھی کوئی کم درجے کا شرک نہیں ہے۔اگر کسی شخص کی محبت اور عقیدت آپ کو اندھا اور بہرا کر دے اور اس کی ہر بات آپ کے لیے سند ہو' اس کی رضا جوئی ہی آپ کے پیشِ نظر رہے تو یہ شخصیت پرستی ہے اور یہ یقیناً شرک ہے۔ یہی بات نبی اکرمﷺ نے فرمائی ہے کہ: ((**حُبُّکَ الشَّیْءَ یُعْمِیْ وَیُصِمُّ**))[2] "تیرا کسی شے سے محبت کرنا تجھے اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے"۔ یہی محبت آج شخصیت پرستی کی شکل میں دنیا میں رائج ہے۔اور قابل غور بات ہے کہ اس کو باقاعدہ ایک سیاسی تصور (political concept) کی حیثیت

(۱) ماسوی اللہ کے لیے لفظ "عبادت" کے بجائے لفظ "پرستش" استعمال ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک طرح کی دیانت ہے۔

(۲) سنن ابی داوٗد' کتاب الادب' باب فی الھوی۔

سے دنیا میں develop کیا گیا ہے۔ گاندھی جی کے اسّی اسّی گز اونچے مجسمے کوئی مشغلے (hobby) کے طور پر نہیں تراشے گئے تھے' بلکہ اس وجہ سے تراشے گئے تھے کہ اس شخص کی عظمت لوگوں کے ذہنوں میں نقش ہو جائے اور اُس سے محبت اور عقیدت رکھنے والے سب ایک دوسرے سے جڑے رہیں۔ جس طرح کہ وطن کی محبت اہل وطن کو مستحکم کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے والی شے (unifying force) ہے۔ یہ شخصیت پرستی دنیا میں پہلے بھی ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہوتی ہے۔ اس کو hero worship کا خوبصورت نام دیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں مسلم لیگ کے زعماء میں سے ایک صاحب کا حال یہ تھا کہ وہ کبھی نماز کے قریب تو پھٹکے نہیں تھے' لیکن اُن کا اپنا کہنا یہ تھا کہ ''میں تو صبح ہی صبح قائداعظم کی تصویر کو سلام کرتا ہوں اور بس یہی میری نماز ہے''۔ اب یہ شخصیت پرستی (hero worship) نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر کوئی غیر یہ بات کرے تو ہم کہتے ہیں وہ بُت پرست ہے اور ہم یہ بات کر کے بھی سمجھتے ہیں کہ ہم تو موحّدِ کامل ہیں اور اس سے ہماری توحید میں کوئی رخنہ پیدا نہیں ہوا۔ ایسے ہی سٹالن کے مجسمے نصب کیے گئے اور اس کی تصویریں بچوں کے ذہنوں کے اندر اتاری گئیں' تاکہ اس کی محبت اور عقیدت ذہنوں پر چھا جائے۔ اسی طرح ماؤزے تنگ کے بُت تراشے گئے۔ تو یہ سب انسان پرستی اور شخصیت پرستی ہے۔ اور یہ ختم نہیں ہوئی' آج بھی اس کا وجود باقی ہے۔

آج کے زمانے میں ایک اور محبت ''نظریے کی محبت'' ہے۔ اگر کسی تصور یا نظریے کی محبت' چاہے وہ اشتراکیت کا نظریہ ہو یا کوئی اور انقلابی نظریہ ہو' انسان کے ذہن پر اس طرح غالب اور مستولی ہو جائے کہ اُس کا جینا اور مرنا اللہ تعالیٰ کے بجائے اُس نظریے کے لیے ہو جائے تو 'معاذ اللہ' یہ اُس نظریے کی پرستش ہے۔ گویا ایک نظریے اور ایک نظام کو پوجا جا رہا ہے۔ کسی نے بڑا پیارا شعر کہا ہے: ؎

اِک تصور کے حسنِ مبہم پر ساری ہستی لٹائی جاتی ہے
زندگی ترکِ آرزو کے بعد کیسے سانسوں میں ڈھالی جاتی ہے!

انسان کے اندر جب تک کوئی آرزو نہ ہو‘ کوئی آدرش نہ ہو‘ کوئی نصب العین نہ ہو تو جینے کا مزا ہی کیا ہے! پھر تو وہ انسان نہیں بلکہ حیوان ہے‘ اُس کی زندگی محض سانسوں میں ڈھالی ہوئی زندگی ہے‘ وہ محض human vegetable ہے۔ لیکن نصب العین صرف ایک ہی صحیح ہے‘ اور وہ ’’اللہ کی محبت‘‘ کا نصب العین ہے۔ جب کوئی اور نصب العین اس جگہ پر آ کر منطبق ہو گیا تو یہی تو شرک ہے۔ جیسے ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَنۡدَادًا یُّحِبُّوۡنَہُمۡ کَحُبِّ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ﴾ (البقرة:١٦٥)

’’اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا کچھ ہستیوں کو (اُس کے) مدّ مقابل بنا لیتے ہیں‘ وہ اُن سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے محبت ہونی چاہیے۔ اور جو لوگ واقعتاً ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ سخت ہیں اللہ کی محبت میں‘‘۔

مَیں یہ بات عرض کر چکا ہوں کہ ’’وطنیت کا نظریہ‘‘ اس دَور کے بہت بڑے شرک کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آیا ہے‘ لیکن ہمارا کوئی بھی عالمِ دین اس کو نہیں سمجھ سکا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے علماء نے بدقسمتی سے مغرب کے فلسفے کا مطالعہ نہیں کیا۔ یہ اپنے تصورات کے پیشِ نظر یہ سمجھتے رہے کہ وطنیت (nationalism) شاید حبّ الوطنی ہے! لیکن اس دَور میں علامہ اقبال نے اس کو خوب سمجھا ہے۔ ان کا بڑا پیارا شعر ہے: ؎

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں اِس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل!

یعنی میں جدید تہذیب وتمدن اور جدید عمرانی نظریات کی آگ میں ڈالا گیا ہوں‘ جیسے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ مغرب کے اِن نظریات اور فلسفے کے پس پردہ کیا کچھ ہے جو اِس اجتماعی زندگی کی بنیاد بنے ہیں‘ اور مسلمان اُمت کو اِس سے آگاہ کرنا اور ان کا ردّ کرنا میرا امتحان ہے۔ علامہ اقبال کو اس چیز کا براہِ

راست مشاہدہ تھا' جبکہ ہمارے علماء اس کو نہیں سمجھ سکے۔ یہ کتاب وسنت کے علم سے خوب واقف ہیں۔ میں کہا کرتا ہوں کہ علم دین کے اعتبار سے ہمارے علماء کی شخصیتیں منگلا ڈیم اور تربیلا ڈیم جیسی ہیں' لیکن جب تک یہ علم اِس دَور کی زمین تک نہ پہنچے تو وہ ڈیم میں کھڑے اُس پانی کی مانند ہے جو تب ہی فائدہ مند ہوتا ہے جب وہ زمین تک پہنچے۔اس اہم کام کے لیے تقسیم کے ذرائع (distribution channels) درکار ہیں جو اِس علم کو آگے پہنچائیں۔لیکن بدقسمتی سے وہ چینلز آج نہیں رہے۔رابطے کا ایک خلاء (gap of communication) بیچ میں حائل ہے کہ بات آگے پہنچ نہیں پا رہی۔لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اِس دَور کے نظریات کو سمجھا جائے۔اس لیے کہ اِس دَور کا شرک تب ہی سمجھ میں آئے گا جب گہرائی میں اُتر کر اس دَور کے نظریات کو سمجھا جائے۔ یہ بات اگرچہ چھوٹی اور غیر اہم محسوس ہوتی ہے لیکن بعض بظاہر چھوٹی باتیں تِل کے اوٹ میں پہاڑ کی مانند ہوتی ہیں۔

ایک صاحب نے جھنڈے کی عظمت اور اس کے وقار کو بچانے کی بات کی ہے۔ یہ بات اپنی حد تک درست بلکہ ضروری ہے' لیکن جھنڈے کو دیکھ کر کھڑے ہو جانا' اسے سلامی دینا' یہ ثابت کیجیے محمدؐ رسول اللہ ﷺ سے! یہ تو قنوت **للعَلَم** ہے کہ آپ جھنڈے کے آگے ہاتھ باندھ کر باادب کھڑے ہو جائیں۔ یہ میرے نزدیک شرک ہے' ورنہ جھنڈے کی عظمت اور وقار کو بچانا اپنی جگہ مسلّم ہے۔جیسے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے غزوۂ اُحد میں اپنی جان کی قربانی دے دی لیکن جھنڈے کو نہیں گرنے دیا۔ایسے ہی حضرت زید بن حارثہ اور حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہما نے کیا۔لیکن جھنڈے کو سلامی دینا اور اس کے لیے خشوع وخضوع کے ساتھ کھڑے ہو جانا قطعاً جائز نہیں ہے۔حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے تو اپنے لیے کھڑا ہونے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو منع فرما دیا تھا۔حضرت ابواُمامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے تشریف لانے پر آپؐ کے لیے احتراماً کھڑے ہوگئے تو آپؐ نے فرمایا:

((لَا تَقُوْمُوْا کَمَا تَقُوْمُ الْاَعَاجِمُ یُعَظِّمُ بَعْضُهَا بَعْضًا))[۱]

''تم لوگ (میرے تشریف لانے پر) کھڑے نہ ہو جایا کرو جیسے کہ عجمی لوگ ایک دوسرے کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

تو ''حبّ الوطنی'' اور چیز ہے اور ''وطن پرستی'' اور چیز ہے۔ اِن دونوں چیزوں میں جب تک فرق نہیں کریں گے اور ان کو علیحدہ علیحدہ اپنے اپنے مقام پر نہیں رکھیں گے تو ذہنوں میں لازماً اشکال پیدا ہو جائیں گے۔

''مراسمِ عبودیت'' صرف اللہ کے لیے ہیں

عبادت کا تیسرا جزو ہے ''مراسمِ عبودیت''۔ رکوع کرنا' سجدہ کرنا' کسی کے لیے مؤدب ہو کر کھڑے ہونا' نذر پیش کرنا اور نذر ماننا یہ سب مراسمِ عبودیت ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے روا ہیں۔ اگر کوئی غیر اللہ کے لیے یہ مراسمِ عبودیت انجام دیتا ہے تو یقیناً غلطی پر ہے اور اس کا یہ عمل شرک ہے' چاہے اُس کی نیت شرک کی نہ ہو۔ اس لیے کہ اُس کے اِس عمل سے نہ معلوم کتنے لوگ گمراہ ہو جائیں۔ محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر جب دین کی تکمیل ہوئی تو سجدۂ تعظیمی بھی حرام قرار دے دیا گیا' حالانکہ اس سے پہلے سجدۂ تعظیمی جائز تھا۔ کسی کے ادب اور تعظیم کے لیے اُس سے جھک کر ملنا انسان کی فطرت اور جبلت میں ہے۔ کوئی کسی بزرگ سے جب ملتا ہے تو ذرا جھک جاتا ہے۔ پچھلے زمانے میں یہ جھکنا رکوع کی حد تک اور اُس سے بھی آگے بڑھ کر سجدے کی حد تک چلا جاتا تھا' اور کسی کے سامنے تعظیماً رکوع اور سجدہ کرنا' بغیر اس عقیدے اور تصور کے کہ اُس میں کوئی الوہیت یا خدائی اختیارات ہیں' ممنوع اور حرام نہیں تھا۔ لیکن جب محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر ہدایتِ ربّانی کی تکمیل ہوئی تو وہ تمام دروازے بند کر دیے گئے جہاں سے یہ گمراہی اور بیماری نقب لگا کر اِس اُمت میں دَر آ سکتی تھی۔ لہٰذا اس سجدۂ تعظیمی کو مستقلاً حرام قرار دے دیا گیا کہ اب کسی نیت سے بھی غیر اللہ کو سجدہ نہیں ہو گا' یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔

---

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الادب' باب فی قیام الرجل للرجل۔

5

اس معاملے میں حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت عظمت کا ایک روشن مینار ہے۔ آپؒ حالانکہ صوفیاء کے طبقے سے تعلق رکھنے والے ہیں، تصوف کے میدان کے مجدّد ہیں، آپؒ کا اصل تجدیدی کارنامہ تصوف کے میدان ہی میں ہے، لیکن یہ شخص سجدۂ تعظیمی کے باب میں حکومتِ وقت سے ٹکرا گیا۔ بقول اقبال: ؎

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

واقعہ یوں ہے کہ سجدۂ تعظیمی مغل دربار کے اندر رائج تھا۔ مجدد الف ثانیؒ نے فتویٰ دیا کہ یہ ناجائز ہے اور شرک ہے۔ اب علماءِ سوء یعنی سرکاری درباری علماء جو حاسدین تھے بہت خوش ہوئے کہ اب یہ صحیح گرفت میں آیا ہے، اس کی بادشاہ کے سامنے پیشی کرائی جائے۔ یہ سجدہ نہیں کرے گا تو بادشاہ کو خود بخود پتا چل جائے گا کہ اس کے دل میں باغیانہ خیالات ہیں۔ چنانچہ بادشاہ کو حضرت مجدّدؒ کے خلاف بھڑکایا گیا اور اُن کی بادشاہ کے سامنے پیشی طے ہوگئی۔ اب اہتمام یہ کیا گیا کہ بادشاہ کے سامنے پیش ہونے کے لیے انہوں نے جہاں سے آنا تھا وہاں ایک دیوار بنا کر اس میں ایک چھوٹی کھڑکی رکھی گئی کہ بادشاہ کے سامنے پیش ہونے کے لیے اس میں سے گزریں گے تب تو سر کو جھکائیں گے۔ لیکن حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ نے اس میں سے نکلتے ہوئے ٹانگیں پہلے نکالیں اور سر بعد میں نکالا کہ یہ شائبہ بھی پیدا نہ ہو کہ اُن کی گردن جہانگیر کے آگے جھکی تھی۔ اس لیے کہ یہ گردن صرف اللہ کے سامنے جھکنے کے لائق ہے۔ یہ قلم تو ہوسکتی ہے لیکن اللہ کے سوا کسی کے سامنے جھک نہیں سکتی۔ لہٰذا جہاں جہاں بھی مراسمِ عبودیت اللہ کے سوا کسی اور کے لیے ادا ہو رہے ہیں، چاہے قبر کو سجدہ ہو رہا ہے یا کسی اور چیز کو، وہ شرک ہے۔

نذرلغیر اللہ شرک ہے

نذر بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ چنانچہ نذر اگر ماننی ہے تو صرف اللہ کے لیے مانی جائے‘ کسی اور کے لیے قطعاً نہیں۔ اوّل تو اسلام کا مزاج یہ ہے کہ نذر کو پسند ہی نہیں کرتا۔ یہ تو گویا بنیا پن کی ذہنیت اور گھٹیا سا انداز ہے کہ اے اللہ! اگر میرا یہ کام ہو جائے تو میں یہ کروں گا اور یہ کام ہو جائے تو میں دو نفل پڑھوں گا۔ تم نے گویا اپنے دو نفلوں کی بڑی قیمت سمجھی ہے۔ اللہ سے یہ سودے بازی نہ کرو‘ بلکہ جو کر سکتے ہو کرو اور اس سے جو بھی مانگنا ہے مانگو۔ اس کے ہاں مانگنے پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے کسی صحابیؓ نے نذر کے بارے میں دریافت کیا تو آپ ؐ نے فرمایا:

((اَلنَّذْرُ لَا یُقَدِّمُ شَیْئًا وَلَا یُؤَخِّرُہٗ ‘ وَاِنَّمَا یُسْتَخْرَجُ بِہٖ مِنَ الْبَخِیْلِ))(۱)

’’نذر کسی شے کو نہ آگے کرتی ہے نہ پیچھے کرتی ہے‘ اس سے تو بس بخیل سے کچھ نکلوا لیا جاتا ہے۔‘‘

یعنی جو لوگ بخل سے کام لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نذر کے ذریعے ان سے کچھ نکلوا لیتا ہے۔ لیکن بہرحال اگر نذر مانی ہو تو اس کو پورا کرنا لازم ہے۔ نیک لوگوں کی صفات میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّہٗ مُسْتَطِیْرًا ۝۷﴾ (الدھر/الانسان)

’’یہ لوگ (دنیا میں) نذر پوری کرتے ہیں اور اُس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی‘‘۔

ایسا نہ ہو کہ کام ہو گیا ہے تو اب جو تھوڑا بہت مانا تھا آدمی اس کو بھی کرنے کو تیار نہ ہو۔ بہرحال نذر بھی صرف اللہ کے لیے ہے‘ کسی اور کے لیے نہیں ہے۔ اگر کسی اور کے لیے نذر مانی گئی تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس کو قادرِ مطلق سمجھا گیا ہے‘ حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا گیا ہے۔ نذر جس کے لیے بھی ہوگی اس کے لیے یہی تصور ذہن میں ہوگا اور یہی تو شرک ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب النذر‘ باب النھی عن النذر وانہ لا یرد شیئا۔

دُعا غیر اللہ کے لیے نہیں ہے

عبادت کے اجزاء میں سے چوتھی چیز دعا ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) [۱] ''دعا عبادت کا جوہر ہے''۔ اور: ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) [۲] ''دعا ہی عبادت ہے''۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝۶۰﴾ (المؤمن)

''اور تمہارے ربّ نے فرمایا ہے کہ مجھے پکارو' میں تمہاری پکار (دعا) کو قبول کروں گا۔ یقیناً جو لوگ میری عبادت سے استکبار کرتے ہیں (گھمنڈ کرتے ہیں) وہ عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل ورسوا ہو کر''۔

یہ آیت بڑی اہم ہے۔ اس کے پہلے ٹکڑے میں لفظ ''دعا'' اور دوسرے ٹکڑے میں لفظ ''عبادت'' آیا ہے۔ یعنی دعا سے اِباء کرنا دراصل عبادت سے اِباء کرنا ہے۔ اگر اللہ کو پکارتے نہیں ہو تو تمہارے اندر استغناء اور تکبر ہے' تم اپنے آپ کو کچھ سمجھے ہوئے ہو۔ مقامِ بندگی یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ کو محتاجِ محض شمار کرے۔ اس پر قرآن مجید میں جو نقطۂ عروج ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے:

﴿رَبِّ اِنِّيْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ۝۲۴﴾ (القصص)

''اے میرے پروردگار! میں تو فقیر ہوں ہر اُس شے کا جو تو میری جھولی میں ڈال دے''۔

ایک فقیر ہوتا ہے پھنے خواں قسم کا کہ دس روپے کا نوٹ ملے تو لے لیتا ہے اور اگر ایک دو روپے کے سکّے ملیں تو پھینک دیتا ہے۔ جبکہ ایک فقیر وہ ہوتا ہے کہ ایک پائی بھی اسے مل جائے تو وہ اس کا بھی محتاج ہے۔ لہٰذا بندگی کا تقاضا ہے کہ اللہ کے سامنے محتاجی ہی محتاجی ہو۔ اس لیے کہ عبد تو ہے ہی محتاج اور مقامِ عبدیت تو ہے ہی مقامِ احتیاج۔ جامۂ استغناء تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو زیب دیتا ہے۔ جیسے فرمایا گیا ہے:

---

(۱) سنن الترمذی' کتاب الدعوات عن رسول اللہ ﷺ' باب منه۔

(۲) سنن الترمذی' کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ ﷺ' باب ومن سورۃ البقرۃ۔

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ﴿۱۵﴾﴾ (فاطر)

''اے لوگو! تم سب کے سب فقیر ہو (محتاج ہو) اللہ کی جناب میں' اور اللہ تو بے نیاز' ستودہ صفات ہے''۔

رسول اللہ ﷺ نے اس کی بڑی پیاری مثال بیان فرمائی ہے کہ ''بندوں کا معاملہ یہ ہے کہ اگر اُن سے تم سوال کرتے ہو تو انہیں ناگوار گزرتا ہے' جبکہ (اس کے برعکس) اللہ کا معاملہ یہ ہے کہ اس سے سوال نہیں کرتے تو اسے ناگواری ہوتی ہے''۔ اللہ کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے کہ میرے بندے مجھ سے مانگتے نہیں۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے راہ روِ منزل ہی نہیں!

مذکورہ بالا آیت ﴿وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ﴾ فعل امر پر مشتمل ہے کہ ''تمہارے ربّ نے کہا ہے کہ مجھے پکارو (مجھ سے دعا کرو) میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا''۔ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ﴿۶۰﴾﴾ (المؤمن) ''یقیناً جو لوگ میری عبادت سے استکبار کرتے ہیں (گھمنڈ میں مبتلا ہیں) وہ عنقریب داخل ہوں گے جہنم میں ذلیل و رسوا ہو کر''۔

اب دیکھئے دعا کرنے اور پکارنے میں توحید یہ ہے کہ ایک اللہ کو پکارنا دیگر تمام پکاروں سے مستغنی کر دے۔ اگر ایک اللہ کے پکارنے نے تمہیں مستغنی نہیں کیا اور اللہ کا پکارنا کافی نہیں ہے تو پھر اللہ کو تمہارے پکارنے کی قطعاً ضرورت نہیں' پھر انہی کو پکارو' اللہ تو بڑا غیور ہے۔ اگر اللہ کو پکارنے کے بعد بھی کسی اور کو پکارنے اور اس سے کچھ مانگنے کی کچھ بھی احتیاج اور امکان باقی ہے تو یہ ''شرک فی الدعاء'' ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمانِ مبارک ہے:

﴿وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴿۱۸﴾﴾ (الجنّ)

''اور یہ کہ مسجدیں (یا وہ اعضاءِ انسانی جن کے اوپر سجدہ ہوتا ہے) سب اللہ کے لیے ہیں' پس اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو''۔

دیکھئے یہاں ''مَعَ اللّٰهِ'' کا لفظ ہے کہ اللہ کے ساتھ ساتھ کسی اور کو بھی پکارا جا رہا ہے تو یہ شرک ہے۔ اور اگر کسی کو اطاعت و محبت اور دعا کے معاملے میں اللہ سے بھی اوپر کر دیا تو یہ شرک سے بھی بڑھ کر گمراہی ہے۔ اور اگر اللہ تبارک و تعالیٰ کو پکارنے کے بجائے کسی اور کو ہی پکارا جا رہا ہو تو یہ تو ﴿ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيۡدًا﴾ والی بات ہے۔ اعاذنا اللّٰه من ذٰلک لہٰذا اللہ تعالیٰ کے علاوہ یا اُس کے ساتھ کسی اور کو مت پکارا جائے۔ یہ ہے ''توحید فی الدعاء''۔ ہم نماز کی ہر رکعت میں اللہ تعالیٰ سے اسی کا وعدہ کرتے ہیں کہ: ﴿اِيَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاکَ نَسۡتَعِيۡنُ﴾ عبادت کا لبِّ لباب اور جوہر چونکہ دعا ہے اور دعا ہی اصل عبادت ہے لہٰذا ہمیں یہ الفاظ سکھائے گئے ہیں: ﴿اِيَّاکَ نَعۡبُدُ﴾ (اے اللہ!) ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے'' ﴿وَاِيَّاکَ نَسۡتَعِيۡنُ﴾ ''اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے''.

دُعا کے ضمن میں ایک اور باریک بحث بھی سمجھ لیجیے! استمداد' استدعا' استنصار اور استغاثہ یہ سب ایک ہی قبیل کے عربی الفاظ ہیں۔ استمداد کا مطلب ہے کسی سے مدد طلب کرنا' استدعا یہ ہے کہ کسی کے سامنے کوئی درخواست پیش کرنا' استنصار سے مراد ہے کسی سے نصرت چاہنا اور استغاثہ یہ ہے کہ کسی کی دہائی دینا۔ اس کی دو شکلیں ہیں۔ ایک شکل ہے باسبابِ ظاہری کسی سے کوئی مدد طلب کرنا۔ مثلاً میں کسی سے کہتا ہوں کہ مجھے ذرا پانی لا کر پلا دیں تو میں نے ایک طرح سے اُس سے مدد طلب کی۔ ظاہری اسباب اور قوانین طبیعی کے اندر اندر کسی سے کچھ مانگنے اور مدد طلب کرنے کے بارے میں تین باتیں جان لینا ضروری ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اس ضمن میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے یہ تلقین کی ہے کہ حتی الامکان کسی سے مدد نہ مانگو' بلکہ اپنے کام خود کرو۔ نبی اکرم ﷺ کا اپنا مزاجِ گرامی تو یہ تھا کہ اگر آپؐ اونٹنی پر سوار ہوتے اور کوڑا زمین پر گر جاتا تو کسی اور سے کہنے کے بجائے اونٹنی کو بٹھاتے اور اتر کر خود ہی کوڑا اٹھا لیتے' تاکہ اسبابِ ظاہری کے اندر بھی کوئی مشابہت پیدا نہ ہو جائے۔ لیکن بہرحال اسبابِ ظاہری کے تحت کسی سے کوئی تعاون طلب کرنا' کسی سے مدد چاہنا اگرچہ یہ بھی ایک طرح کی دعا

اور پکار ہے مگر اس میں شرک کا پہلو نہیں ہے' بلکہ یہ اپنے اپنے مزاج سے متعلق ہے۔ البتہ اگر کسی شخص کے بارے میں یہ بات دل میں بیٹھ جائے کہ یہ شخص میرا کام کر سکتا ہے اور اس وجہ سے اُس کے سامنے گریہ وزاری بھی ہو رہی ہو اور تضرّع بھی ہو رہا ہو تو یہ ایک درجے میں شرکِ خفی بن جاتا ہے۔ اُس وقت دراصل آدمی حجاب اور مغالطے میں آ چکا ہوتا ہے اور ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ'' کی نفی کر دیتا ہے۔ اس ضمن میں صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ کسی شخص سے کچھ مانگنا ہے تو اس عقیدے اور یقین کے ساتھ مانگو کہ وہ شخص تمہارے لیے صرف وہی کچھ کر سکے گا جو اللہ چاہے گا۔ یعنی اللہ ہی اس کے دل میں بات ڈالے گا کہ وہ تمہارے لیے وہ کام کرے۔ بہرحال اسبابِ ظاہری کے ساتھ جتنا شغل اور شغف روا ہے اس سے زائد جب ہو جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان ظاہری اسباب و وسائل پر ہی تکیہ' بھروسہ اور یقین و ایمان پیدا ہو گیا ہے۔

آپ اپنی بڑی بوڑھیوں کو دیکھتے ہوں گے کہ جب وہ بچے کو دوا پلا رہی ہوتی ہیں تو شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ کہہ رہی ہوتی ہیں کہ ''اللہ شافی' اللہ کافی''۔ مریض کو دوا پلانا تو رسول اللہ ﷺ کی سنت اور ہدایت ہے' لیکن توحید یہ ہے کہ توکل اور بھروسہ دوا پر نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ پر ہو کہ دوا میں تأثیر تب ہو گی اگر اللہ چاہے گا' شافی اصل میں دوا نہیں ہے بلکہ اللہ ہے۔ اللہ چاہے تو بغیر دوا کے بھی شفا دے دیتا ہے۔ وہ شافی بھی ہے اور کافی بھی ہے۔ لیکن اس کے برعکس کیفیت وہ ہوتی ہے کہ گھلے جا رہے ہیں اس صدمے سے کہ ہم اپنے بچے کے لیے فلاں ڈاکٹر کا علاج نہیں کرا پا رہے' یا علاج کے لیے امریکہ یا انگلستان نہیں بھیج پا رہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا اصل تکیہ اور توکّل خدا کی ذات کے بجائے دوا پر ہو گیا ہے۔ نادانوں کو یہ معلوم نہیں کہ امریکہ اور انگلستان میں بھی لوگ مرتے ہیں۔ سارے آپریشنز اور جدید ترین علاج کے باوجود موت کا علاج تو وہاں بھی نہیں ہے اور بہترین معالجوں کے ہاتھوں بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ امریکہ میں تو اس سپیشلا ئزیشن کے دَور میں بھی بڑے بڑے بلنڈرز اور حماقتیں ہو رہی ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ شفا اُن کے ہاتھ میں ہے۔ صحیح طرزِ عمل یہی ہے کہ

جتنے کچھ اسباب و وسائل ہماری استطاعت میں ہیں اُن سے استفادہ کریں اور عقیدہ یہ رکھیں کہ شفا صرف اور صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ‘ معاذ اللہ‘ ان وسائل کا محتاج نہیں ہے‘ وہ جو کرنا چاہے بغیر کسی سبب کے خود کرنے پر قادر ہے۔ اور اسباب میں بھی کوئی تاثیر نہیں ہے جب تک اللہ نہ چاہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ نے اپنے بچے کو نصیحت کرتے ہوئے صد فی صد درست کہا تھا کہ: لَا فَاعِلَ فِی الْحَقِیْقَۃِ وَلَا مُؤَثِّرَ اِلَّا اللّٰہُ ’’فاعلِ حقیقی اور مؤثرِ حقیقی اللہ کے سوا کوئی نہیں‘‘۔ تو ظاہری اسباب میں بھی جب آدمی کسی کے سامنے گڑگڑائے‘ اپنے آپ کو اس کے سامنے ذلیل کرے اور اپنی عزتِ نفس کا دھیلہ کرے یہ سمجھ کر کہ بس یہی میرا کام کر سکتا ہے اور اسی کے ہاتھ میں میرا خیر یا شر ہے تو وہاں شرکِ خفی کی آمیزش پیدا ہو جاتی ہے۔ البتہ ظاہری اسباب سے بالاتر ہو کر اللہ کے سوا کسی کو ہرگز نہیں پکارا جا سکتا‘ نہ کسی ولی کی روح کو‘ نہ کسی نبی کی روح کو اور نہ کسی فرشتے کو۔ کسی غیر اللہ کے لیے استمداد‘ استدعا‘ استنصار اور استغاثہ کُل کا کُل شرک ہے۔

اس ضمن میں ایک لطیف سی بحث اور بھی ہے جس کی میں وضاحت کر دینا چاہتا ہوں۔ صوفیاء کے ہاں یہ رائے بڑی عام اور پھیلی ہوئی ہے کہ اولیاء اللہ کی روحیں انتقال کے بعد ملائکہ کے طبقۂ اسفل کے ساتھ شامل کر دی جاتی ہیں۔ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی اس عالمی حکومت کے کارندے ہیں۔ یہ اس کی سول سروس ہے کہ فلاں حکم کی تنفیذ کے لیے اسے فلاں فرشتے کے حوالے کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ حکم اللہ تعالیٰ ہی کا ہوتا ہے۔ فرشتوں کے بارے میں قرآن حکیم میں آیا ہے:

﴿لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَا اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ﴿۶﴾﴾ (التحریم)

’’وہ (فرشتے) اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے‘‘۔

ملائکہ کے مختلف طبقات ہیں۔ یعنی ملأ اعلیٰ‘ ملائکہ مقربین‘ ساتوں آسمانوں کے ملائکہ اور پھر ملائکۃ الارض۔ ملائکۃ الارض جو ہیں وہ طبقۂ اسفل ہے‘ یعنی سب سے نچلا طبقہ

جو یہاں اللہ کے احکام کی تنفیذ میں لگا ہوا ہے۔ تو ایک رائے یہ ہے کہ اولیاء اللہ کی ارواح کو بھی اُن کے انتقال کے بعد ملائکہ کے طبقۂ اسفل میں شامل کر دیا جاتا ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی سول سروس میں شریک ہو جاتے ہیں۔ مجھے اگرچہ کتاب وسنت سے ایسی کوئی دلیل نہیں ملی کہ میں حتمی طور پر یہ کہہ سکوں کہ یہ رائے درست ہے، لیکن یہ خارج از امکان بھی نہیں ہے اور میرے نزدیک اِس کو مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ساتھ مجھے ایک گہری محبت ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپؒ قرآن وسنت کا بہت گہرا فہم رکھتے تھے۔ انہوں نے بھی یہ رائے ظاہر کی ہے اور احادیثِ مبارکہ سے دلائل بھی دیے ہیں۔ ایک دلیل آپؒ یہ لائے ہیں کہ جب غزوۂ موتہ میں حضرت جعفر بن ابی طالب (جعفر طیار) رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور اُن کے دونوں بازو کٹ گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((رَاَیْتُ جَعْفَرًا یَطِیْرُ فِی الْجَنَّۃِ مَعَ الْمَلَائِکَۃِ))(۱)

''میں نے دیکھا کہ جعفرؓ ملائکہ کے ساتھ جنت میں اڑتے پھر رہے ہیں۔''

اگرچہ اس حدیث مبارکہ کی رو سے یہ معاملہ شہداء سے متعلق ہے، لیکن اگر اس دلیل کو مان بھی لیا جائے کہ ملائکہ کے طبقۂ اسفل میں اولیاء اللہ کی ارواح بھی شامل ہو جاتی ہیں اور احکامِ خداوندی کی تنفیذ میں ملائکہ کے ساتھ وہ بھی شامل ہو جاتے ہیں، پھر بھی اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکلتا کہ ان کو پکارا جائے۔ یہ تو خیر طبقۂ اسفل سے متعلق ہیں، ملأ اعلیٰ کو پکارنا بھی شرک ہے۔ اگر کوئی کہے کہ یَا جِبْرَاءِ یْلُ اَغِثْنِیْ ''اے جبرائیل! میری مدد کو پہنچو'' تو یہ شرک ہو جائے گا۔ پکارا جائے گا صرف اللہ کو۔ وہ مدد کے لیے چاہے جبرائیل کو بھیجے، میکائیل کو بھیجے یا کسی ولی اللہ کی روح کو بھیج دے، یہ اُسی کا کام ہے۔ ہمیں اجازت نہیں ہے کسی اور کو پکارنے کی۔ ہمیں بس یہی حکم ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کو پکارو۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰہِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾﴾ (الجن) ''پس اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو!'' اور: ﴿وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ﴾

(۱) رواہ الطبرانی عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔

(القصص:۸۸) ''اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو مت پکار''۔ اگر کوئی شخص علمی اعتبار سے اولیاء اللہ کے بارے میں مذکورہ بالا رائے رکھتا ہے تو اس میں شرک کا کوئی پہلو نہیں ہے' لیکن اگر ان کو پکارا جائے گا تو یہ شرک ہو جائے گا۔ مافوق العادت یعنی قانونِ طبیعی وظاہری سے اوپر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو پکارا جائے تو اس کے شرک ہونے میں قطعاً کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

عبادت کی قبولیت کی شرطِ لازم —— اخلاص

عبادت کا پانچواں اور آخری جزو ''اخلاص'' ہے جو عبادت کی قبولیت کی شرطِ لازم ہے۔ اس کی ضد ہے ریا اور سُمعہ' یعنی لوگوں کو دکھانے اور سنانے کے لیے کوئی نیک کام کرنا کہ لوگ میری مدح وستائش کریں۔ ان کے شرک ہونے میں بھی کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے' اور ان کا شرک ہونا رسول اللہ ﷺ نے خوب واضح کیا ہے۔ ایک حدیث نبویؐ ملاحظہ ہو:

((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ))(۱)

''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی وہ شرک کر چکا' جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا وہ شرک کر چکا اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ کیا وہ شرک کر چکا۔''

عربی زبان میں فعل ماضی پر جب ''قَدْ'' لگتا ہے تو فعل حال مکمل (Present Perfect Tense) کا مفہوم پیدا کرتا ہے کہ فلاں کام قطعی اور یقینی طور پر ہو چکا' اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہماری ہدایت اور رہنمائی کے لیے اسے اس قدر باریک بینی کے ساتھ واضح کیا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہوا اور وہ یہ دیکھتے ہوئے کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے' نماز ذرا رُک رُک کر اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا شروع کر دے' سجدہ ذرا طویل کر دے تو یہ ''شرکِ خفی'' ہے۔ میں

---

(۱) مسند احمد۔

مثال کے طور پر بیان کیا کرتا ہوں کہ اگر آپ نماز پڑھ رہے ہوں اور آپ کو کوئی دیکھ نہ رہا ہو تو آپ معمول کے مطابق تین سیکنڈ کا سجدہ کریں' لیکن جب آپ دیکھیں کہ کوئی آپ کو دیکھ رہا ہے تو اب آپ کا سجدہ پانچ سیکنڈ کا ہو جائے' تو آپ سوچیں کہ مزید دو سیکنڈ کا سجدہ کس کے حساب میں ہے؟ جان لیجیے کہ آپ کا تین سیکنڈ کا معمول کا سجدہ تو اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے ہے' جبکہ دو اضافی سیکنڈ کے سجدے کا مسجود اللہ نہیں ہے بلکہ وہ ہے جسے آپ دکھا رہے ہیں۔ گویا ایک سجدے کے دو مسجود ہو گئے اور یہی شرک ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے ''شرکِ خفی'' کہا ہے' اعاذنا اللہ من ذٰلک۔ ''شرکِ خفی'' کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس کا دیکھنا اور پہچاننا اتنا ہی مشکل ہے جتنا انتہائی تاریک رات میں سیاہ پتھر پر رینگتی ہوئی ایک سیاہ چیونٹی کو دیکھنا مشکل ہے۔ اب سوچیے کہ کون بچے گا اس شرک سے؟

شرک کی معین کردہ تین اقسام سامنے آ جانے کے بعد یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کے بارے میں یہ کہہ دے کہ میرا یہ بندہ مشرک نہیں ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝١٣٥﴾ (البقرۃ) ''اور وہ (یعنی میرا بندہ ابراہیم) مشرکین میں سے نہیں تھا''۔ معلوم ہوا کہ جو کچھ کہا جا سکتا تھا اس ایک جملے میں کہہ دیا گیا۔ اس سے بڑی مدح و ستائش اور شاباش اور کیا ہو گی اور اس سے بڑی سند' اس سے بڑا سرٹیفکیٹ اور شہادت نامہ (testimonial) اور کیا ہو گا کہ ''میرا فلاں بندہ مشرکین میں سے نہیں تھا''۔ یہی بات ہے جو بڑے پیارے انداز میں اقبال نے کہی ہے: ؎

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

اپنے سینوں کے اندر جو بُت کدے آباد ہیں اِن کی طرف انسان کی نظر نہیں جاتی' جبکہ باہر کے بُت کدے نظر آ جاتے ہیں۔ آپ نے گنیش جی کا بُت پوجتے ہوئے کسی کو دیکھا

تو کہا یہ شرک ہے۔ آپ نے کسی قبر کو سجدہ کرتے ہوئے کسی کو دیکھا تو کہا یہ شرک ہے۔ آپ نے کسی کو کسی غیر اللہ کو پکارتے ہوئے سنا تو کہا یہ شرک ہے۔ یہ بات درست ہے۔ اس چیز کے شرک ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ لیکن اپنی نگاہ کو ذرا اور وسیع کیجیے اور دیکھئے کہ آپ کے عقیدے اور عمل میں کہاں کہاں شرک کی آمیزش ہے۔ خاص طور پر اس دَور کے جو شرک ہیں ان کو سمجھئے! یہ مادہ پرستی کا شرک' وطن پرستی کا شرک' شخصیت پرستی کا شرک' اپنی ہوا و ہوس کو پوجنے کا شرک اور خود پرستی کا شرک کہ خود اپنے آپ کو پوج رہے ہیں ؏ ''اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں'' اپنی ہی ذات اور نفس کے گرد انسان طواف کیے چلا جا رہا ہے' یہ اصل میں اس دَور کے شرک ہیں جن کو سمجھنا ہوگا۔ بہرحال ہر خیر اور بھلائی خواہ وہ نظریے اور فکر کی ہو' عقیدے کی ہو' علم کی ہو' عمل کی ہو' اخلاق کی ہو' وہ توحید ہی کا کوئی گوشہ اور توحید ہی کی کوئی شاخ (corollary) ہے۔ ؏ ''یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں!'' اس کے برعکس ہر زیغ' کجی اور گمراہی چاہے وہ نظریے اور فکر کی ہو' عقیدے کی ہو' علم کی ہو' عمل کی ہو' اخلاق کی ہو' شرک ہی کی کوئی نہ کوئی صورت ہے۔

کیا اللہ کی ہر معصیت شرک ہے؟

اب بعض حضرات کے ذہنوں میں شدت سے یہ سوال پیدا ہو رہا ہوگا کہ شرک کی جو مذکورہ بالا تشریح سامنے آئی ہے اس کی رو سے تو اللہ کی ہر معصیت شرک ہے؟ مثال کے طور پر اللہ کا حکم تھا نماز پڑھو' مگر ہم نے اللہ کا حکم چھوڑ کر نفس کا حکم مانتے ہوئے نماز ترک کر دی تو یہ شرک ہو گیا۔ ایسے ہی مال کمانے میں ہم نے شریعت کا حکم ترک کر دیا اور اللہ کی محبت سے مال کی محبت بڑھ گئی تو یہ شرک ہو گیا۔ اس طرح سے تو ہر گناہ شرک ہے۔ جبکہ قرآن مجید دو جگہ فرماتا ہے کہ: ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ﴾ (النساء: ۴۸ و ۱۱۶) ''یقیناً اللہ تعالیٰ اِس کو تو ہرگز معاف نہیں فرمائے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے' البتہ اس سے کم تر گناہ جس کو چاہے گا بخش دے گا''۔ تو اب وہ کمتر کا دائرہ جس میں مغفرت کی امید ہے' وہ کیا ہے؟ یہ سوال بہت

اہم اوراس پوری بحث سے متعلق ہے۔ یہ سوال ذہنوں میں لازماً پیدا ہونا چاہیے۔اگر کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا نہیں ہو رہا تو گویا اُس نے ''حقیقت واقسامِ شرک'' کی اس پوری بحث پر توجہ ہی نہیں کی۔

گناہوں کے باب میں ایک بات تو یہ جان لیجیے کہ قرآن مجید نے ایک طرف تو صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کی تقسیم کی ہے اور صغائر کے بارے میں بہت امید دلائی ہے کہ وہ معاف ہو جاتے ہیں۔ان کے بارے میں ایک قاعدہ کلیہ تو یہ سامنے آتا ہے کہ ان پر گرفت شدید نہیں ہے۔ چنانچہ سورۃ النجم میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿الَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ﴾ (آیت ۳۲) ''جولوگ بڑے بڑے گناہوں اور کھلے کھلے قبیح افعال سے پرہیز کرتے ہیں اِلّا یہ کہ کچھ قصور (چھوٹے گناہ) اُن سے سرزد ہو جائیں''۔ چھوٹے چھوٹے گناہوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے' اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی گرفت نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ' معاذ اللہ' خوردہ گیر نہیں ہے کہ ہر چھوٹی چھوٹی بات کی گرفت فرمائے۔ یہی بات سورۃ الشوریٰ میں یوں فرمائی گئی: ﴿وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ......﴾ (آیت ۳۷) ''وہ لوگ کہ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں......'' تو معلوم ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''صغائر'' کا معاملہ کئی اعتبارات سے کبائر سے الگ رکھا ہے۔

گناہوں کے بارے میں قرآن وحدیث سے ایک تصور یہ بھی سامنے آتا ہے کہ صغیرہ گناہ خود بخود بھی دھلتے رہتے ہیں۔ارشادِ الٰہی ہے: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ (ھود:۱۱۴) ''یقیناً اچھائیاں سیّئات (چھوٹی چھوٹی برائیوں) کو ختم کر دیتی ہیں۔'' جب آپ کوئی نیکی کرتے ہیں تو صغائر دھلتے رہتے ہیں' لیکن کبائر نہیں۔ کوئی شخص نماز کی غرض سے مسجد کی طرف چلے تو ہر قدم پر اُس کے صغیرہ گناہ معاف ہو رہے ہوتے ہیں۔ایک حدیث نبویؐ میں آتا ہے کہ وضو کرتے ہوئے جب کوئی شخص ہاتھوں کو دھوتا ہے تو اس کے ہاتھوں کے صغیرہ گناہ دھل جاتے ہیں۔اسی طرح باقی اعضاءِ وضو کے متعلق فرمایا کہ ان کو دھوتے ہوئے ان سے سرزد ہونے والے گناہ دھل

جاتے ہیں۔ یہ دین کے حقائق ہیں اور ان سے قطعاً کسی درجے میں بھی اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔

گناہ کے بارے میں قرآن مجید دوسرا فرق یہ کرتا ہے کہ ایک ہے ''کسب'' کہ جان بوجھ کر اور ارادے سے کوئی غلط کام کرنا' جبکہ ایک ہے ''خطا اور نسیان'' کہ ذہول ہو گیا' بھول گئے' غفلت کا پردہ پڑ گیا' لٰہذا کوئی غلطی صادر ہو گئی۔ اس میں ارادے اور کسب کو دخل نہیں۔ بالفاظِ دیگر غلط کام کرنے کی نیت نہیں تھی مگر خطا اور نسیان سے غلط کام ہو گیا۔ خطا کا مطلب ہے نشانے کا چوک جانا۔ یعنی نشانہ لگانا چاہ رہے تھے کہیں اور لیکن لگ گیا کہیں اور۔ تو نسیان اور خطا سے گناہ کا صادر ہو جانا اور شے ہے' جبکہ کسب سے گناہ کا صادر ہو جانا اور شے ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ یہ عرش کے نیچے کے خزانوں میں سے دو اہم خزانے ہیں اور یہ تحفہ شبِ معراج کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی وساطت سے اُمتِ مسلمہ کو عطا کیا ہے۔ ان میں سے دوسری آیت کا ایک ٹکڑا ہماری اس بحث سے متعلق ہے۔ الفاظ ملاحظہ ہوں: ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا﴾ (آیت ۲۸۶) ''اے ربّ ہمارے! اگر ہم سے بھول اور خطا (سے کوئی غلطی سرزد) ہو جائے تو ہماری گرفت نہ کیجیو!'' لیکن اگر کسب ہو رہا ہو اور جان بوجھ کر کوئی گناہ کمایا جا رہا ہو اور اُس پر پھر ڈیرہ جما لیا جائے تو اس صورت میں یقیناً ایک بڑا گناہ بھی شرک کے درجے کو پہنچ جاتا ہے۔ ایک شخص سود کو اپنے کاروبار میں مستقلاً شامل کیے ہوئے ہے تو اس میں کسی نسیان اور خطا کا معاملہ نہیں' بلکہ اس نے ارادی طور پر اور علیٰ وجہ البصیرت ایک حرام چیز کو اختیار کر رکھا ہے اور وہ اُس کے کاروبار کا جزوِ لاینفک ہے تو یہ چیز درحقیقت شرک ہے۔ جان لیجیے کہ اگر منطقی طور پر تجزیہ کریں گے تو ہر گناہ شرک بن جائے گا' اس لیے کہ معصیت کا دانستہ ارتکاب کر کے ایک شخص نے گویا اپنی خواہشات و جذبات اور دُنیوی مفادات کو اللہ کے احکام پر فوقیت دے دی یا انہیں اللہ کی پسند و ناپسند کے برابر لے آیا۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا اکرم اور مہربانی ہے کہ جب تک گناہ ذہول' خطا اور

نسیان کے درجے میں ہو تو اُس کو شرک قرار نہیں دیا گیا۔ لیکن میں یہ بات بتکرار و اعادہ عرض کر رہا ہوں کہ اگر کوئی غلط کام ''کسب'' کے درجے میں ہو اور فیصلے' شعور اور ارادے کے ساتھ کیا جا رہا ہو اور اس پر انسان مستقلاً ڈیرا جما کر بیٹھ جائے تو وہ شرک کے درجے کو پہنچ جائے گا۔ البتہ اگر اضطراری حالت درپیش ہو' انسان کی جان پر بنی ہو اور وہ بھوک سے مرا جا رہا ہو تو اس حالت میں انسان سؤر بھی کھا لے تو گناہ نہیں ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی : ﴿فَمَنِ اضۡطُرَّ غَیۡرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡهِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۷۳) ''پس جو مجبور ہو (بشرطیکہ) سرکشی اور حد سے تجاوز نہ ہو تو (مذکورہ بالا حرام اشیاء کھا لینے میں) اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔'' ایسے ہی اگر جان پر بنی ہو اور سود کے علاوہ جان بچانے کا کوئی راستہ نہ ہو تو یہ بھی معاف ہے۔

اس ضمن میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۱ ملاحظہ کیجیے۔ ارشاد ہوا: ﴿بَلٰی مَنۡ کَسَبَ سَیِّئَةً ......﴾ ''کیوں نہیں! جس نے ایک برائی بھی کمائی (کسب کیا)......'' خطا' نسیان اور اضطرار اس میں شامل نہیں ہے' بلکہ یہ وہ برائی ہے جو جان بوجھ کر کمائی گئی ہو اور چاہے وہ ایک ہی کیوں نہ ہو۔ ''سَیِّئَةً'' اسم نکرہ ہے۔ نکرہ میں تفخیم بھی ہوتی ہے کہ کوئی بڑی چیز۔ یعنی اس میں ''صغائر'' شامل نہیں ہیں' بلکہ صرف ''کبائر'' ہیں۔ آگے فرمایا: ﴿وَاَحَاطَتۡ بِهٖ خَطِیۡٓـَٔتُهٗ ......﴾ ''اور اس کا گھیرا کر لیا اس کے گناہ نے......'' اس ایک گناہ پر وہ اس طرح ڈیرا جما کر بیٹھا ہوا ہے کہ گناہ نے اُس کو اپنے گھیرے میں ایسے لے لیا ہے کہ کوئی جانب ایسی نہیں جہاں گناہ کا غلبہ نہ ہو۔ ﴿فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۱﴾﴾ (البقرۃ) ''تو یہی لوگ جہنمی ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ کے لیے رہیں گے''۔ یعنی یہ وہ جہنمی نہیں ہیں جو آگ سے بالآخر نکل آئیں گے۔ یہ خلود فی النار کی سزا ہے جو کفار اور مشرکین کے لیے ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک بڑا گناہ بھی اگر یہ شرطیں پوری کر رہا ہو کہ وہ فیصلے اور ارادے سے کیا گیا ہو اور اُس پر دوام ہو اور اُس نے عاصی کا اس طرح احاطہ کر لیا ہو کہ کوئی جانب ایسی نہ رہی ہو جہاں گناہ کا غلبہ نہ ہو تو وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے شرک ہے۔ البتہ اگر کسی سے خطا ہو جائے اور اُس پر اُس

کو پشیمانی ہو اور احساس ہو جائے کہ اس سے غلطی ہوئی ہے اور وہ اللہ سے بخشش طلب کرے' اس پر ڈیرا نہ جما لے اور اسے اپنی زندگی کا مستقل جزو بنانے کا ارادہ نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کا حساب و کتاب صاف کر دیتا ہے۔

شرکیہ اعمال کرنے والوں پر مشرک کا فتویٰ؟

اس ضمن میں ایک بہت بڑا مسئلہ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ ہمارے ہاں بعض لوگ ایسے ہیں کہ اُن کی روحِ توحیدی جب زیادہ بیدار ہو جاتی ہیں تو وہ مشرک کا فتویٰ لگانے کے لیے بڑے بیتاب ہوتے ہیں کہ فلاں بھی مشرک اور فلاں بھی مشرک۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ ہر چیز کا تجزیہ کر کے بتا دیا جائے کہ یہ شرک ہے' لیکن کرنے والے کو مشرک ہرگز نہ کہا جائے۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ قرآن مجید نے جہاں بُت پرستوں کو مشرک قرار دیا ہے وہاں اہل کتاب کو مشرک قرار نہیں دیا۔ ان کا شرک بیان کیا ہے' لیکن ان کی کیٹیگری جدا رکھی ہے۔ آخری وقت تک بھی یہ دو کیٹیگریز علیحدہ علیحدہ رہی ہیں۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ط﴾ (البیّنۃ:٦) ''یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا اہل کتاب میں سے اور مشرکین میں سے وہ جہنم کی آگ کے مستحق ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔ معلوم ہوا کہ مشرکین میں سے کفار اور اہل کتاب میں سے کفار یہ دو علیحدہ کیٹیگریز ہیں۔ ایک مسلمان کفارِ اہل کتاب کی لڑکیوں سے شادی کر سکتا ہے' لیکن کفارِ مشرکین کی لڑکیوں سے شادی نہیں کر سکتا۔ شریعت کے اندر یہ فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تو نام ہی رکھا ہے ''مشرک''۔ جبکہ اہل کتاب اگرچہ شرک میں ملوث ہیں' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ﴾ (التوبۃ:٣١) اور: ﴿قَالَتِ الْیَھُوْدُ عُزَیْرُ نِ ابْنُ اللّٰہِ وَقَالَتِ النَّصٰرَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰہِ ط﴾ (التوبۃ:٣٠) ''یہودیوں نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا مسیح (عیسیٰ علیہ السلام) اللہ کا بیٹا ہے''۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کا شرک تو بیان کیا ہے لیکن ان کو مشرک قرار نہیں دیا۔ چنانچہ قرآن مجید سے اس انداز سے کسبِ ہدایت

کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی مسلمان جس نے مسلمان ماں کا دودھ پیا ہے اور اس کی جو ایک ذہنی ساخت بنی ہوئی ہے اور جس مٹی سے اس کا خمیر اٹھا ہے وہ جان بوجھ کر شرک نہیں کر سکتا۔ یہ سب مغالطے اور گمراہیاں ہیں' ناسمجھی اور غلو ہے۔تو اِن گمراہیوں کی نفی کیجیے' انہیں واضح کیجیے' ہدایت کو عام کیجیے اور اس میں مداہنت ہرگز نہ کیجیے' لیکن ایسے لوگوں پر شرک کے فتوے لگا کر اُن سے اپنے آپ کو کاٹ لینا یا اُن کو خود سے کاٹ دینا' یہ نہ تو قرآن مجید کی روح کے مطابق ہے اور نہ ہی محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے اُسوہ کے مطابق ہے۔شرک کو بیان کرنے میں مداہنت نہ کی جائے' لیکن جس شخص کے اعمال میں شرک کی آمیزش نظر آجائے اُس پر گرامر کا قانون لاگو کرتے ہوئے اسے مشرک نہ کہہ دیا جائے۔ایسے ہی کفر کا معاملہ ہے۔اگر احادیث نبویؐ کی روشنی میں تجزیہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ جس نے ایک نماز بھی ترک کی اُس نے کفر کیا۔ حدیث نبویؐ ہے : ((اَلصَّلَاةُ عِمَادُ الدِّيْنِ)) ''نماز دین کا ستون ہے''۔ اور:((مَنْ تَرَکَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ))جس نے جان بوجھ کر (بغیر کسی شرعی عذر کے) نماز کو ترک کر دیا وہ کفر کر چکا۔'' اور:((اَلْفَرْقُ بَيْنَ الْإِسْلَامِ وَالْكُفْرِ الصَّلَاةُ)) ''کفر اور اسلام کے درمیان (کافر اور مسلم کے درمیان) فرق (حدّ فاصل) نماز ہے۔'' تو کیا جس نے ایک نماز چھوڑی اسے کافر کہہ دیا جائے گا؟ اِن چیزوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔جن لوگوں کے اندر جذبۂ توحید اور دینی حمیت بیدار ہو جاتی ہے میں ان کے لیے بھی ہمدردی کے ساتھ یہ بات عرض کر رہا ہوں کہ وہ اپنے خلوص اور اخلاص ہی کی وجہ سے حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔اس ضمن میں ضرورت اس بات کی ہے کہ شرک کو شرک ضرور کہا جائے' لیکن جو مسلمان ہیں اُن کے اُوپر شرک کے فتوے لگا کر اُن کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دینا حکمتِ دین' حکمتِ اصلاح و دعوت اور حکمتِ تبلیغ کے خلاف ہے۔

مذکورہ بالا بحث کی وضاحت کے لیے میں ایک اور مثال دیتا ہوں۔ دیکھئے چوری ایک پیسہ کی بھی چوری ہے۔مسجد سے کوئی تھوڑا سا سامان چرا لیا جائے تو وہ بھی چوری

ہے' لیکن قطعِ ید کی سزا ہر چوری پر نہیں ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ کسی نے ایک روپیہ کسی کا چرا لیا تو اُس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ معاذ اللہ' اسلام میں ایسا ظلم نہیں ہے۔ ایسے ہی مشترک مال میں سے ایک فریق کچھ مال چرا لے تو اُس پر بھی قطعِ ید کی سزا لاگو نہیں ہو گی' اس لیے کہ وہ مال چرانے والا خود اس کی ملکیت میں شریک ہے۔ اسی طرح غیر محفوظ مال کی چوری پر بھی چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ چنانچہ جس چوری پر قطعِ ید کی سزا ہے فقہاءِ کرام نے اس کی پوری وضاحت سے تعریف (definition) کی ہے۔ باقی چوریوں پر تعزیر ہے کہ قانون کے تحت کسی کو قید کی سزا دے دی جائے یا کچھ کوڑے مارے جائیں۔ تو جس طرح ایک پیسہ کی چوری بھی چوری ہے' لیکن جس چوری پر شرعی چوری کا اطلاق ہو گا اور ہاتھ کٹے گا وہ کچھ اور شے ہے۔ اسی طرح اگر تجزیہ کریں گے تو ہر گناہ شرک ہے' اس میں کوئی شک نہیں ہے' لیکن شرک کا اطلاق ہر گناہ پر نہیں ہو گا۔ بلکہ اگر وہ کسب میں داخل ہے' بڑا گناہ ہے اور مستقل ہو گیا ہے تو وہ یقیناً شرک کے درجے کو پہنچ جائے گا لہٰذا اس فرق کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے! ہر گناہ کا ارتکاب کرنے والا مشرک نہیں ہو جائے گا۔ اور اگر کسی مسلمان کا کوئی گناہ شرک کی تمام شرائط پوری کر رہا ہے تو پھر بھی اس پر مشرک کا فتویٰ لگانے کی کیا ضرورت ہے! اللہ تبارک وتعالیٰ حساب لینے والا موجود ہے۔ بلکہ اسلامی ریاست کے اندر بھی کسی مسلمان پر مشرک کا فتویٰ نہیں لگے گا۔ اس میں بھی ''مسلم'' اور ''کافر'' دو ہی کیٹیگریز ہیں' تیسری کوئی کیٹیگری معین نہیں ہے۔ یہ تقسیم تو ہو سکتی ہے کہ فلاں شخص کافر ہے اور فلاں مسلم ہے' لیکن کسی کو مشرک قرار دے دینا' اس کا فتویٰ کسی قانونِ شرعی کے اندر موجود نہیں ہے۔ ایسے ہی کسی کو منافق قرار دینا' اس کا بھی کوئی فتویٰ قانونِ شریعت میں موجود نہیں ہے۔ اس دنیا میں کسی کو ہم یہ سند بھی نہیں دے سکتے کہ وہ مؤمن ہے۔ یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ کس کے دل میں کتنا ایمان ہے۔ ہم اس کو زیرِ بحث نہیں لا سکتے' ہم تو زیرِ بحث لائیں گے اسلام اور کفر کو۔ اور تکفیر بھی جان لیجیے کہ انفرادی معاملہ (individual act) نہیں ہے کہ جو شخص چاہے کھڑا ہو کر فتویٰ دے دے کہ فلاں

کافر ہے' بلکہ یہ اسلامی ریاست کا کام ہے کہ وہ تکفیر کا فیصلہ کرے۔ اس کو بھی ہمارے ہاں بازیچۂ اطفال بنا لیا گیا ہے۔ لہٰذا کسی شخص کے اندر ذرا سا بھی شرک کا شائبہ نظر آ جائے تو اس کو مشرک قرار دے دینا اور اُس کے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار کرنا جو مشرکین کے ساتھ ہے' یہ سراسر غلو ہے۔ اس غلو نے ایسی کھینچ تان پیدا کر دی ہے کہ اب فریقین کے مابین میل جول (communication) نہیں رہا۔ طبقات بالکل جدا ہو گئے ہیں' ایک دوسرے کی بات سننے اور سمجھنے کے لیے کوئی تیار ہی نہیں۔ دیکھئے اگر ہم نے کسی معاملے میں اپنے نفس کی خواہش کو اللہ کے حکم پر مقدم رکھا تو ہم ہرگز پسند نہیں کرتے کہ کوئی ہمیں مشرک قرار دے۔ اسی طرح ہمیں چاہیے کہ اس طرح کی نرمی اور رعایت (concession) دوسروں کو بھی دیں' بلکہ اپنے سے زیادہ دیں۔

مختصر یہ کہ شرک کی مذمت لازماً کی جائے' اس میں مداہنت ہرگز نہ ہو' لیکن کسی کو مشرک قرار دے کر اُس سے قطع تعلق کر لینا' یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے کسی بھلائی کی کوئی امید نہیں' بلکہ نقصان ہی کا اندیشہ ہے۔

اقول قولی ھذا واستغفراللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

(مرتب: طارق اسماعیل ملک)

دعوت و تحریک

دعوت وتذکیر کا عمل

عتیق الرحمٰن صدیقی

تمام مذاہب اور ادیان کے مقابلے میں اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ ہر حیثیت سے کامل اور اکمل دین ہے۔ یہ تمام بنی نوعِ انسان کے لیے ہے' کاملیت کے شرف کی بدولت آخری دین ہے اور انسان کی نجات کے لیے ضروری ہے کہ وہ صرف اسی دین کی پیروی کرے۔ گویا ہر فرد اسلام پر ایمان لانے کا مکلّف ہے۔ ایمان نہ لانے کی صورت میں بدبختی اس کا مقدر ہے۔ اسلام کی اس مخصوص حیثیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا پیغام ہر آدمی تک پہنچے اور مسلسل پہنچتا رہے۔ یہ فریضہ نہایت اہم ہے۔ نبی اکرمﷺ نے اس ذمہ داری کو بطورِ احسن نبھایا اور پھر یہ کام اُمت مسلمہ کے سپرد کر دیا کہ وہ اُمتِ وسط ہونے کے ناطے سے اسلام کا پیغام تمام انسانوں تک پہنچائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرۃ:۱۴۳)

''اور اس طرح ہم نے تم (مسلمانوں) کو ایک بہتر اُمت بنایا ہے تاکہ تم دوسرے تمام لوگوں کے اُوپر (ہمارے نازل کیے ہوئے دین کے) شاہد بنو اور (ہمارا) رسول تمہارے اُوپر شاہد بنے''۔

گویا اس اہم کام کی تکمیل کا یہ حل تجویز کیا گیا کہ جو کام اللہ کے رسولؐ اپنی زندگی میں کرتے رہے' ان کے پیروکار اور نام لیوا جب تک اس زمین میں موجود ہیں اس کام کے تسلسل کو برقرار رکھیں۔ یہ کام شہادت کی طرز کا ہو اور ٹھیک اسی طریق پر ہو جو نبی کریمﷺ اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے پیش نظر رہا۔ اس عالم گیر دعوت کے مسلسل جاری رہنے کی ممکنہ شکل یہی تھی کہ نبی اکرمﷺ اپنا قائم مقام گروہ تیار کریں جو اتنا راسخ العقیدہ' پختہ فکر اور اتنا معیاری مسلم ہو کہ شہادتِ حق کا عظیم الشان فرض نہایت خوش اسلوبی سے ادا کرتا رہے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ......﴾ (آل عمران: ۱۱۰)

''تم ایک بہترین اُمت ہو جو سارے انسانوں کے لیے وجود میں لائی گئی ہو......''

دوسری جگہ فرمایا گیا:

﴿هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ (الحج:۷۸)

''اس نے تمہیں منتخب کیا ہے اور تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔ اپنے باپ ابراہیمؑ کے راستے کی پیروی کرو۔ اس نے پہلے ہی سے تمہارا نام ''مسلم'' رکھا ہے اور اسی خصوص میں رکھا ہے تاکہ رسول تمہارے لیے (دین حق کا) شاہد ہو اور تم دوسرے تمام لوگوں کے لیے شاہد بنو۔''

انسانوں کو دعوتِ حق کا پیروکار بنانے، انہیں دین حق پر قائم رکھنے، جادۂ رشد و ہدایت پر عزیمت و استقامت سے آگے بڑھنے اور دین کو زندگی کے ہر شعبے میں قائم کرنے اور غالب رکھنے کا کام اہم بھی ہے، عظیم الشان بھی ہے اور مسلسل و پیہم ریاضت کا متقاضی بھی ہے۔ یہ کام انفرادی نوعیت کا نہیں بلکہ گروہی اور اجتماعی طور پر مل کر کرنے کا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (آل عمران)

''تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ اور (جو لوگ یہ کام کریں گے) وہی فلاح پانے والے ہیں۔''

صاحبِ ضیاء القرآن نے اس آیۂ کریمہ کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''ضرور ہونی چاہیے تم میں ایک جماعت جو بلایا کرے نیکی کی طرف اور حکم دیا کرے بھلائی کا اور روکا کرے بدی سے۔ اور یہی لوگ کامیاب و کامران ہیں۔''

بھلائی کا حکم دینے اور بدی سے روکنے کا کام قوت و طاقت کے بغیر ممکن نہیں، یہی وجہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو یہ دعا سکھلائی:

﴿وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ

﴿مِنۡ لَّدُنۡکَ سُلۡطٰنًا نَّصِیۡرًا﴾ (بنی اسراء یل)

''اور (اے نبی!) دعا کرو کہ پروردگار! مجھ کو تُو جہاں بھی لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے''۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس آیۂ کریمہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یعنی یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر' یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تاکہ اس کی طاقت سے میں دنیا کے اس بگاڑ کو درست کر سکوں' فواحش و معاصی کے اس سیلاب کو روک سکوں اور تیرے قانونِ عدل کو جاری کر سکوں۔ یہی تفسیر ہے اس آیت کی جو حسن بصری اور قتادہ نے کی ہے اور اسی کو ابن کثیر اور ابن جریر جیسے جلیل القدر مفسرین نے اختیار کیا ہے' اور اسی کی تائید نبی ﷺ کی یہ حدیث کرتی ہے کہ ((اِنَّ اللّٰہَ لَیَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَا لَا یَزَعُ بِالْقُرْآنِ)) یعنی ''اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے اُن چیزوں کا سدّ باب کر دیتا ہے جن کا سدّ باب قرآن سے نہیں کرتا''۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے وہ محض وعظ و تذکیر سے نہیں ہو سکتی' بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لیے سیاسی طاقت بھی درکار ہے۔ پھر جبکہ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خود سکھائی ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اقامتِ دین اور نفاذِ شریعت اور اجرائے حدود اللہ کے لیے حکومت چاہنا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ مطلوب و مندوب ہے اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اسے دنیا پرستی یا دنیا طلبی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دنیا پرستی اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص اپنے لیے حکومت کا طالب ہو۔ رہا خدا کے دین کے لیے حکومت کا طالب ہونا تو یہ دنیا پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی ہی کا عین تقاضا ہے۔ اگر جہاد کے لیے تلوار کا طالب ہونا گناہ نہیں ہے تو اجرائے احکامِ شریعت کے لیے سیاسی اقتدار کا طالب ہونا آخر کیسے گناہ ہو جائے گا؟''

(تفہیم القرآن' حاشیہ ۱۰۰' سورۂ بنی اسرائیل)

سورۃ الشوریٰ میں واضح طور پر فرما دیا گیا کہ:

﴿شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ﴾ (الشوریٰ: ۱۳)

''اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا

اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے' اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں' اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ''۔

اس آیۂ کریمہ میں دین کو قائم کرنے اور پھر قائم رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ دین کو قائم کیے بغیر اس کا قائم رکھنا ممکن نہیں۔

غلبۂ دین کے لیے قائم کی جانے والی جماعت اپنے اندر ایک انفرادیت رکھتی ہے۔ وہ ہمہ پہلو اور ہمہ جہت ہوتی ہے اور زندگی کے ہر دائرے پر حاوی ہوتی ہے۔ وہ پوری زندگی کو اپنی گرفت میں لینے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کی کارکردگی کا انداز صاف ستھرا' پاکیزہ اور غیر مبہم ہوتا ہے اور وہ جائز و ناجائز میں تفریق کر کے آگے بڑھتی ہے۔ گویا یہ ہمہ گیر نوعیت کی تحریک ہے' زندگی کے تمام شعبوں کی تطہیر اس کے پیش نظر ہے۔ اتنا بڑا اور عظیم الشان کام بہت زیادہ عزیمت و استقامت کا متقاضی ہوتا ہے۔ عزمِ بالجزم کے ساتھ' نئے سوز اور نئی روح کے ساتھ آگے بڑھتے رہنے میں ہی عافیت ہے' مگر انسان لڑکھڑا جاتا ہے۔ وہ طبعاً تھڑدلا بھی ہے اور جلد باز بھی' مصیبت و تکلیف میں اس کا مایوس اور دل شکستہ ہو جانا فطری امر ہے۔ حالات کی نامساعدت جب اس کے عزائم کو کمزور کرتی ہے تو وہ بددل اور شکستہ خاطر ہو جاتا ہے۔ ایسے میں یا تو وہ چند مراسم عبودیت پر اکتفا کر لیتا ہے یا دُنیوی اُمور میں اپنی دلچسپیاں بڑھا لیتا ہے۔ جماعتی عصبیت کسی نہ کسی حد تک قائم رہتی ہے مگر نصب العین سے جذباتی وابستگی اور والہانہ لگاؤ دم توڑ دیتا ہے۔

انسان اگر اپنی داعیانہ حیثیت کا مکمل ادراک رکھتا ہو' اللہ کی مدد پر اُس کو بھروسہ ہو اور فطرتِ انسانی کے حقائق کی تفہیم اسے حاصل ہو تو وہ مایوس نہیں ہوتا اور نہ یہ نتیجہ مستنبط کر کے بیٹھ جاتا ہے کہ اس کی تمام تر تبلیغ اور دعوت بے ثمر اور بے نتیجہ رہی ہے۔ اس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنا پیغام دوسروں تک پہنچاتا رہے' یاس و حرماں کا شکار ہو کر بیٹھ نہ جائے' رحمت عالم ﷺ سے بھی یہی کہا گیا کہ آپؐ نذیر اور مذکر ہیں' داروغہ نہیں' اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ آپ پر وحی کیا جاتا ہے اسے آگے پہنچا دیجیے۔ یہ حقیقت ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ دل اللہ کی توفیق سے کھلتے ہیں' بندۂ مؤمن دعوت و تذکیر کا مکلّف تو ہے مگر کسی کا دل بدلنے پر قادر نہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام مسلسل نو سو سال تک اپنی قوم کو توحید کی دعوت دیتے رہے' بالآخر پکار اٹھے کہ رات دن کی مسلسل تبلیغ کے باوجود یہ قوم راہِ راست اختیار کرنے پر آمادہ نہیں۔ حضرت

ابو طالب اپنے بھتیجے کے لیے بے شمار قربانیاں دینے کے باوجود اسلام قبول کرنے سے قاصر رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کی راہ پر گامزن کر دیتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپؐ خواہ مخواہ غم و افسوس میں ان لوگوں کی خاطر اپنی جان مت گھلائیے گا' وہ تو اسی کو ہدایت دیتا ہے جو اُس کی طرف رجوع کرے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دعوتِ حق کو قبول کرنے میں ذرا بھی ردّ و قدح سے کام نہیں لیتے' مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ پورے چھ سال کی کشمکش کے بعد ایمان لاتے ہیں اور ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے ردّو قبول کے فیصلہ پر اکیس سال گزر جاتے ہیں۔ گویا اخذ نتائج میں عجلت کارگر ثابت نہیں ہوتی بلکہ کوششوں کا تسلسل ضروری ہوتا ہے۔

حق کا داعی مکلّف ہے اس بات کا کہ وہ اپنی علمی' ذہنی' جسمانی اور مادی صلاحیتوں کے مطابق اصلاح و تطہیر اور دعوت و تذکیر کا عمل جاری رکھے۔ وہ نہ صرف اپنے روابط کو احسن انداز میں کام میں لائے بلکہ اپنے دائرۂ اثر و رسوخ میں حکمتِ بالغہ اور موعظتِ حسنہ کے ذریعے مثبت ثمرات کو مجتمع کرنے کی سعی کرے۔ اس کا تبادلۂ خیال اور بحث و تکرار کا طریق دلنشیں اور خوبصورت ہو' گویا ''وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ'' کا عکاس ہو۔ فتح و نصرت کے قرآنی وعدے کا حصول ممکن تب ہی ہے جب صبر و ثبات کی صفت داعیٔ حق کا شعار بن جائے اور وہ اجتماعیت کا ناگزیر حصہ بن کر رہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے امداد اور نصرت کے وعدے منتشر لوگوں سے نہیں کیے بلکہ اہل ایمان کی جماعت سے کیے ہیں اور **اعتصام بحبل اللّٰہ** (اللہ کی رسّی یعنی قرآن کو مضبوطی سے تھامنے) کی شرط عائد کی ہے۔ داعیانِ حق پر لازم ہے کہ وہ اپنی افرادی قوت بڑھانے کے لیے ہر لحظہ فکرمند رہیں' اپنی کاوشوں کو زیادہ نہ سمجھیں بلکہ ایک طرف اگر ان کو فزوں تر بنائیں تو دوسری طرف اپنے احتساب سے غافل نہ ہوں' بلکہ اپنی غلطیوں' کوتاہیوں پر نگاہ رکھیں' ان سے مجتنب رہیں اور اللہ سے استغفار بھی کرتے رہیں اور جہدِ مسلسل کو بروئے کار لاتے ہوئے صرف ایک آرزو میں گھلتے رہیں کہ اللہ کی زمین پر اللہ کا دین غالب ہو اور اقتدار اللہ کے صالح بندوں کے ہاتھ میں ہو اور یوں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے جو فکر و عمل کے اعتبار سے نبی اکرم ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کا عکس پیش کرتا ہو۔ یہ ہے وہ ہدف جو دعوت و تذکیر' تنذیر و تبشیر اور وعظ و تلقین کا منصب سنبھالنے والوں کے پیشِ نظر ہر لحظہ موجود رہنا ضروری ہے۔ نبی کریم ﷺ کی مکی اور مدنی زندگی کا ماحصل یہی ہے۔ مکی دور کی تمام تر جدوجہد اور دعوتی سرگرمیوں کا نتیجہ ایک اسلامی ریاست کی صورت میں ضوفشاں ہوا۔ ○○

1

دعوت فکر

نئی نسل کی بے راہ روی
ذمہ دار کون؟

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

قائداعظم محمد علی جناح نے بجا طور پر نئی نسل کو معاشرے کے اہم ترین افراد گردانا ہے۔ نئی نسل ہی قومی اور ملی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے والی ہے۔ اگر نوجوانوں کی تربیت صحیح نہج پر ہو تو قوم کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر نوجوانوں کی اکثریت لہو و لعب میں محو اور لوٹ کھسوٹ میں مشغول ہو تو ظاہر ہے کہ قوم کی کشتی بس ڈوبنے ہی والی ہے۔ قوم کے باشعور اور ذمہ دار لوگوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ نوجوانوں کی تربیت پر نظرِ عقاب رکھیں اور انہیں صحیح اقدار اور اخلاق کی تعلیم سے آراستہ کریں۔ اس ذمہ داری کو وہ یہاں تک محسوس کریں کہ اپنے تجربات کی روشنی میں ان کوتاہیوں کی بھی پیش بندی کریں جنہیں وہ نوجوانی میں اختیار کر کے ان کے نتائج بد سے نہیں بچ سکے۔

آج جب ہم اپنے معاشرے کی نئی نسل کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو ہم اسے تباہی کی طرف رواں دواں دیکھتے ہیں۔ ان حالات میں معاشرے کا ہر باشعور فرد یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر نئی نسل کی بربادی کا ذمہ دار کون ہے؟ جب ہم اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ معاشرے کا کوئی ایک طبقہ یا گروہ ہی خاص طور سے نئی نسل کی تباہی کا ذمہ دار نہیں ہے' بلکہ بہت سے عوامل ہیں جو انحطاط کے اس عمل میں کل پرزوں کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ بعض افراد تو شعوری طور پر اس عمل میں حصہ لے رہے ہیں جبکہ کچھ بے شعوری اور لاشعوری طور پر مصروفِ عمل ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ بلاشبہ والدین سے بڑھ کر اپنی اولاد کا کوئی خیر خواہ نہیں ہوتا' والدین اپنی اولاد پر جان

چھڑکتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُن کے فرزند ارجمند معزز اور معاشرے کے ذی وقار افراد ہوں' لیکن مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ والدین اپنی عدم توجہی' معاشی مصروفیت یا تغافل کی وجہ سے اپنی اولاد کی تربیت خود اپنی خواہش کے مطابق نہیں کر پاتے۔ چونکہ والدین اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے اوّلین ذمہ دار ہوتے ہیں اس لیے نئ نسل کی بربادی کے ذمہ داروں میں سب سے پہلے والدین کا ذکر ہی مناسب ہے' اگرچہ بعد کے دلائل اس بات کی وضاحت کر دیں گے کہ والدین نئ نسل کی بربادی کے صرف جزوی ذمہ دار ہیں اور اس ضمن میں مؤثر ترین کردار چند دوسرے عوامل کا ہے۔

والدین پر اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری کا بوجھ قدرتی طور پر ڈالا گیا ہے۔ والدین کو اس ذمہ داری کا احساس بھی ہے' لیکن اکثر والدین معاشرے میں اپنی قابلِ ذکر حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے روزی کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور اولاد کی تربیت کی طرف سے غفلت برتتے ہیں۔ وہ اولاد کی تربیت اور تعلیم کی ذمہ داری سکول کے اساتذہ پر ڈال دینا چاہتے ہیں اور ان حالات میں وہ اپنے طور پر مطمئن بھی ہو جاتے ہیں کہ ہم اپنی اولاد کی تربیت پر پیسے خرچ کر رہے ہیں۔ اگر انہیں کوئی اچھا استاد بطور ٹیوٹر مل جائے تو وہ اپنی ذمہ داری اُس پر ڈال کر خود کو بالکل فارغ البال محسوس کرتے ہیں' حالانکہ اپنی ذمہ داری کا بوجھ کسی غیر ذمہ دار کے کندھوں پر ڈالنا بالعموم اچھی اور نتیجہ خیز بات نہیں ہوتی۔ والدین کی یہ غفلت اُس وقت سب سے زیادہ شدید اور غالباً ناقابل تلافی ہو جاتی ہے جب والد کے ساتھ بچوں کی والدہ بھی معاشی حالت کی بہتری کے لیے کہیں ملازمت کر رہی ہو۔ اس طرح اگرچہ گھر کی معاشی حالت تو ضرور بہتر ہو جاتی ہے لیکن بچوں کی تربیت اکثر عجیب رنگ لاتی ہے۔ والدہ اور والد جب صبح سویرے اپنے اپنے کام پر نکل جاتے ہیں تو گھر میں نوکرانی بچوں کی نگرانی پر مأمور ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نوکرانی بچوں کی نگران تو ضرور ہو گی لیکن وہ فطری طور پر والدہ کی طرح شفیق اور مشفق ثابت نہیں ہوسکتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے اس ماحول میں پرورش پاتے ہیں جو سراسر شفقت سے محرومی کا مظہر ہوتا ہے۔ جس بچے نے شفقت سے محرومی میں پرورش پائی ہو وہ بڑا ہو کر شفیق اور رحم دل کیونکر ہوسکتا ہے! ایسے نوجوان لاشعوری طور پر معاشرے سے انتقام لینے کے لیے چل پڑتے ہیں۔ موجودہ دَور میں کھاتے پیتے خوشحال خاندانوں کے نوجوانوں کا ڈاکہ زنی اختیار کرنا اسی قسم کی تربیت کا نتیجہ ہے' اگرچہ دوسرے عوامل نے بھی انہیں متأثر کیا ہے۔

انگریز نے کئی سو سال تک برعظیم پاک و ہند پر حکمرانی کی اور یہاں کے باشندوں کے قلوب و اذہان کو متأثر کیا۔ ہم انگریز کی جسمانی غلامی سے تو آزاد ہو گئے لیکن ذہنی غلامی کا اثر ہنوز تر و تازہ ہے۔ یہاں انگریز کی برتری کے احساس کا یہ حال ہے کہ جو لوگ شلوار قمیص پہننے کے عادی ہیں انہیں جب بھی دانشوروں کے کسی اجلاس میں جانا ہوتا ہے تو وہ کوٹ پتلون زیبِ تن کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے انہوں نے انگریزی لباس تیار رکھا ہوتا ہے۔ آپ نے کسی انگریز کو بمشکل ہی غیر انگریزی لباس میں دیکھا ہوگا۔ شلوار قمیص میں کیا قباحت ہے؟ حالانکہ انسان اس میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے اور بدن بھی غیر ضروری طور پر کسا ہوا نہیں ہوتا۔ پھر ہمارا دین ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہننے کی ترغیب دیتا ہے۔ اگرچہ ہمارے نوجوانوں نے انگریزی دَور کے ماہ و سال نہیں دیکھے لیکن جب وہ معاشرے میں ان دونوں لباسوں کو زیرِ استعمال دیکھتے ہیں تو اپنے طور پر انگریزی لباس کو بہتر سمجھ لیتے ہیں۔ نوجوانوں کے اس فیصلے کو ہم کسی حد تک حق بجانب کہہ سکتے ہیں' کیونکہ انگریزوں کے چلے جانے کے ۵۸ سال بعد بھی ہماری عدالتوں میں انگریزی قانون چل رہا ہے' انگریزی زبان کا تسلط ہے اور انگریزی سکولوں کی بالادستی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے کے ذمہ دار افراد اپنی نوجوان نسل کو عملاً انگریزوں کی برتری کا سبق دے رہے ہیں۔ افسوس کہ اسلامی ملک میں جہاں مسلمان مدعی' مسلمان مدعیٰ علیہ اور مسلمان ہی جج ہیں' فیصلہ انگریز کے قانون کے تحت ہوتا ہے۔ کیا مسلمانوں کا اپنا کوئی قانون نہیں؟ کیا نئی نسل کو تباہی کے راستے پر ڈالنے والوں میں ہم قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک کے تمام برسر اقتدار لوگوں کے نام نہیں لے سکتے؟ یہ ذمہ داری قوم کے بڑوں پر ہے کہ وہ اپنے تہذیبی ورثے کی قدر کریں اور نوجوان ان سے سیکھ کر اپنی روایات کو قابل افتخار سمجھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ نئی نسل کو گمراہ رکھنے میں اُن تمام افراد کا حصہ ہے جو فکراً یا عملاً ابھی تک انگریز کی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اگر ہمیں شلوار قمیص کو ترک ہی کرنا ہے تو عربی لباس ہمارے لیے پسندیدہ ہونا چاہیے' کیونکہ یہ ہمارے اسلاف کا لباس رہا ہے اور موجود ہے۔

نئی نسل کی تباہی میں ہماری اخباری صحافت نے بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ گندی' مضر اور مخربِ اخلاق چیزوں کی تشہیر پر کالم کے کالم لکھے جاتے ہیں لیکن اسلامی تعلیمات کا ذکر محض تبرک کے لیے کیا جاتا ہے۔ جرائم کی خبریں جلی سرخیوں میں شائع کی جاتی ہیں جنہیں لوگ پڑھتے ہیں۔ چونکہ ملکی قوانین اور انتظامیہ کا طریق کار کچھ اس قسم کا ہے کہ بینک لوٹنے

والوں‘ ڈاکہ ڈالنے والوں‘ قاتلوں اور بدمعاشوں کو شاذ ہی سزا ملتی ہے اس لیے نوجوان ذہن جس میں ذرا سی جرأت ہو‘ وہ ان برے طریقوں کو اپنانے میں ایک قسم کی ترغیب پاتا ہے اور اسے اظہارِ جرأت‘ مہم جوئی اور بہادری کا کارنامہ سمجھ کر کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے اور اس طرح دولت مند بننے کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہوتا دیکھتا ہے۔ اگر ملکی قوانین اسلامی ہوں اور اسلامی ضابطۂ اخلاق کے ماتحت فساد مچانے والوں کو سرعام پھانسی‘ کوڑوں اور قید کی عبرت ناک سزائیں ملیں تو آئندہ کسی نوجوان کو جرائم پر دلیری کرنے کا حوصلہ نہ رہے۔ اخبارات میں اخلاقی جرائم کی خبریں نمایاں کر کے شائع کی جاتی ہیں جو اخلاقی اقدار کی پامالی کی حوصلہ افزائی کا اشتہار ہوتی ہیں۔ بعض رسالے ایسے شائع ہوتے ہیں جو محض بداخلاقی‘ گناہ کی زندگی اور جرائم کی ترغیب کی تشہیر کرتے ہیں۔ ان میں قزاقوں‘ ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کی حقیقی اور فرضی کہانیاں نہایت دلکش پیرائے اور مؤثر انداز میں پیش کی جاتی ہیں۔ گویا قومی تعمیر میں ان کا منفی کردار روزِ روشن کی طرح عیاں ہے‘ لیکن اس کے باوجود اُن کی اشاعت پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

ابلاغِ عامہ کے دو ادارے ریڈیو اور ٹیلیویژن بھی منفی کردار ادا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رہے ہیں۔ محتاط اندازے کے مطابق ریڈیو کے پچاس فیصد پروگرام اور ٹیلی ویژن کا نوے فیصد وقت اس نسل کو تباہی کی راہ پر ڈالنے کے لیے بڑی کامیابی کے ساتھ صرف ہو رہا ہے۔ انگریزی اور انڈین فلمیں‘ کارٹون اور بے ہودہ ڈرامے وغیرہ مغرب اور عشاء کے درمیان دکھائے جاتے ہیں‘ مگر اسلامی تعلیمات کے چند پروگرام جو محض تبرکاً پیش کیے جاتے ہیں‘ اُن کا وقت رات ساڑھے دس یا اُس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ امسال حج کا براہِ راست منظر تو دن کو دوپہر کے وقت دکھایا گیا لیکن رات کو اُس پروگرام کا وقت گیارہ بجے تھا۔ رمضان شریف میں ٹی وی پر ہر روز ایک پارے میں بیان شدہ تعلیمات کا خلاصہ پیش کرنے کا اہتمام کیا گیا لیکن مقرر کو اس کے لیے صرف پندرہ منٹ دیے جاتے۔ مقرر کی انتہائی کوشش کے باوجود پورے پارے کا خلاصہ ہمیشہ تشنہ رہتا۔

ٹیلی ویژن پر چونکہ متحرک تصاویر نظر آتی ہیں اس لیے نوجوان نسل کے لیے اُن کے اندر ایک کشش پائی جاتی ہے۔ اگر ٹیلیویژن پروگرام اسلامی تعلیمات اور اخلاقی اقدار کی اشاعت پر مشتمل ہوں تو اس پُرکشش ذریعے سے نئی نسل ضرور متأثر ہو اور اُن کے قلوب اور اذہان اسلامی رنگ میں رنگے جائیں۔ مگر صورتِ حال نہ صرف افسوس ناک بلکہ خطرناک حد تک

بگڑی ہوئی ہے۔ جو ڈرامے دکھائے جاتے ہیں اُن میں بیشتر ایسے ہوتے ہیں جن میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو چوری چھپے ملاقاتیں کرتے اور پیار و محبت کے نغمے الاپتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ کیا مسلمانوں کے ضابطۂ اخلاق میں اس چیز کی اجازت ہے؟ قرآن وسنت کی تعلیمات کی رو سے بالغ عورتوں کے لیے پردہ کرنا فرض ہے۔ حیا عورت اور مرد کی زینت ہے۔ مرد اور عورت کا اختلاط فساد کا موجب ہے۔ جس نبیٔ محترم ﷺ نے اُمہات المؤمنین کو نابینا سے بھی پردہ کرنے کا حکم دیا اُس کا کلمہ پڑھنے والے نوجوان لڑکے لڑکیاں انتہائی بے باکی سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اُن کی اس طرح کی عشقیہ ملاقاتیں ٹیلیویژن کے ذریعے ملک کے دُور دراز گوشوں میں بیٹھے ہوئے معصوم بچوں تک بھی پہنچائی جاتی ہیں۔ مختلف کاروباری اشتہار ٹیلیویژن پر دکھائے جاتے ہیں جہاں عورت کے حسن و جمال کی نمائش ہی اشتہار کی روحِ رواں ہوتی ہے۔ عورتیں ہی اناؤنسر ہیں اور عورتیں ہی خبریں سناتی ہیں۔ یوں معاشرے میں معصیت کی نشرواشاعت کے اس ادارے کی موجودگی میں نوجوان نسل سے شرم وحیا اور اسلامی اقدار سے محبت کی توقع محض ایک دھوکا اور فریب ہے۔ بقول شاعر ؎

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہٗ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش!

پاکستان ٹیلیویژن کے اربابِ بست وکشاد نئی نسل کو تباہی کے راستے پر گامزن کرنے کے سب سے زیادہ ذمہ دار ہیں' کیونکہ ابلاغِ عامہ کے اس ذریعے سے نئی نسل کے اندر اخلاق کی عظمت' دین کی محبت اور بزرگانِ دین کے عظیم کارناموں کی اشاعت کی جاسکتی ہے' مگر اس کے منفی استعمال سے یہ تفریح جرائم کی ترغیب اور گناہ کا محرک بن کر رہ گئی ہے۔

سینما ایک مقبولِ عام تفریح ہے۔ کہنے کو تو یہ تفریح ہے لیکن اسے مخربِ اخلاق ادارہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ فلمیں اس قدر گھٹیا معیار کی دکھائی جاتی ہیں جن میں نصیحت کا پہلو تو برائے نام ہوتا ہے لیکن عشق کی داستان اور شہوانی جذبات کا اظہار نمایاں ہوتا ہے۔ جب نوجوان ایسی فلمیں دیکھتے ہیں تو سکولوں اور کالجوں کی خشک اور پیشہ ورانہ تعلیم میں انہیں کوئی لذت محسوس نہیں ہوتی' بلکہ اُن کی دل پسند شخصیتیں فلمی اداکار اور اداکارائیں بن جاتے ہیں اور وہ سڑکوں پر گھومتے پھرتے مختلف موسیقاروں کے گانے گنگناتے نظر آتے ہیں۔ بزرگوں کا مقولہ ہے کہ بچے کی مثال گیلی مٹی کے برتن کی ہے کہ اُسے آپ خواہش کے

مطابق شکل دے سکتے ہیں' لیکن جب اُس کچے برتن کو آگ میں پختہ کرلیا جائے تو اُس کی کجی دور کرنا ممکن نہیں رہتا۔ جب ہمارے بچے چڑھتی جوانی میں عشق کے رسیا ہو گئے اور اپنے جنسی جذبات پر قابو نہ رکھ سکے تو نتیجہ بے راہ روی کے سوا اور کیا ہو گا؟ آپ مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں اغوا اور زنا کے واقعات کی کس قدر کثرت ہے۔ آئے دن گھر سے بھاگے ہوئے بچے جب پکڑے جاتے ہیں تو تفتیش کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فلمی اداکار بننے کے شوق میں گھر کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ کیا یہ ہماری فلموں کا اثر نہیں ہے؟

سینما نوجوانوں کی کردار سازی میں قابل ذکر کردار ادا کر سکتا ہے۔ بزرگوں کے کارنامے اور بہادری کے واقعات پر مشتمل فلمیں بنائی جائیں تو یہ نوجوانوں کو صحیح سمت کی طرف راہ نمائی کر سکتی ہیں۔ لیکن صورت حال بالکل برعکس ہے۔ ہماری کون سی فلم ایسی ہے کہ جس میں گناہ کی دعوت دینے والا نسوانی کردار نہ ہو! اسی پر بس نہیں بلکہ یہاں تو فحاشی اور عریانی کے مناظر کی کثرت ہی کسی فلم کے معیاری ہونے کی علامت سمجھی جاتی ہے۔

علم روشنی ہے اور جہالت تاریکی۔ علم انبیاء کی وراثت ہے۔ علم کے بغیر انسان خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ اہل علم معاشرے کے روحِ رواں ہوتے ہیں۔ صاحب علم لوگ باشعور اور باخبر ہوتے ہیں۔ مگر آج کے ماحول میں علم کی کوئی قدر نہیں رہی۔ تعلیم محض ملازمت حاصل کرنے اور معاشی مسائل کے حل کے لیے حاصل کی جاتی ہے۔ اس لیے جب نوجوان نسل دیکھتی ہے کہ گریجوایٹ اور پوسٹ گریجوایٹ حضرات معمولی تنخواہ کی نوکریاں کر رہے ہیں' مگر اَن پڑھ لوگ جنھوں نے ناجائز ذرائع سے دولت اکٹھی کرنے کا مشغلہ اختیار کر رکھا ہے' دنیا کی نظروں میں معزز ہیں تو اُن کے لیے تعلیم حاصل کرنے میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی۔ وہ بچے جو ذوق وشوق سے تعلیم حاصل کرتے ہیں' جب اُن کے انٹرویوز اخبارات میں چھپتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر' انجینئر بن کر قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اُن کا مدعا بھی بظاہر تو قوم کی خدمت ہوتا ہے لیکن اصل میں وہ دولت پیدا کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی واقعی ڈاکٹر بن جاتا ہے تو وہ ہر شخص سے' بلا امتیاز مفلس وتونگر' اپنی بھاری معائنہ فیس وصول کرتا ہے۔ جو شخص ڈاکٹر بن کر ہزاروں روپے یومیہ کماتا ہے اگر وہ بزعم خود قوم کی خدمت کا جذبہ ظاہر کرے تو کون اس کو باور کرے گا!

دولت دنیا میں عزت وسرفرازی کا باعث ہے۔ دولت کے ساتھ عیش وعشرت کی زندگی

گزاری جاتی ہے۔ دولت سے ناجائز کام کروائے جا سکتے ہیں' اس لیے کہ ہمارا معاشرہ اس کا رسیا ہو چکا ہے۔ آج یہ الفاظ ہر شخص کی زبان پر ہیں کہ پیسہ ہو تو کون سا کام نہیں ہو سکتا؟ ہماری نوجوان نسل یہ مشاہدہ کرتی ہے کہ تعلیم یافتہ شریف آدمی کی معاشرے میں کوئی قدر نہیں ہے' وہ کسی مقامی مسئلے میں بطور مشیر نہیں بلایا جاتا' مگر علاقے کے دولت منداور بااثر لوگ ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ مقامی مسائل کے حل کے وقت وہ مشیر خاص ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ پولیس کی خاطر تواضع کر سکتے ہیں لہٰذا تھانے میں بھی اُنہیں کرسی پیش کی جاتی ہے۔ پولیس کسی کو ملزم کی حیثیت سے پکڑ لے تو یہ دولت مند افراد اسے تھانے سے چھڑا کر لے آتے ہیں۔ معاشرے کے کمزور' غریب اور شریف لوگ ناخواندہ اور جاہل مگر دولت مند لوگوں سے خائف رہتے ہیں۔ یہ منظر ہماری نوجوان نسل کو متأثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تعلیم حاصل کر کے پروفیسر یا ٹیچر یا خطیب بن گئے تو معاشرہ اُن کی کیا قدر کرے گا؟ لیکن اگر انہوں نے بے علم رہ کر ناجائز دولت کمانے کا دھندااختیار کر لیا تو انہیں معاشرے میں برتری حاصل ہو گی' لہٰذا وہ برتری کے حصول کا یہی راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ملازمین میں بھی دو طبقے ہو جاتے ہیں۔ جو جائز ذرائع سے کماتے ہیں وہ بمشکل گزارہ کرتے ہیں' لیکن جو ناجائز کماتے ہیں انہیں بہت ہوشیار اور زیرک سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح معاشرے میں منفی اقدار کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے اور شرافت اور تعلیم کو چنداں اہمیت نہیں دی جا رہی۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ملک میں انتخابات ہوئے۔ سرکاری ملازمین یعنی تعلیم یافتہ افراد کی اکثریت کو مختلف پولنگ اسٹیشنوں پر متعین کر دیا گیا۔ گھروں سے باہر ہونے کی وجہ سے یہ لوگ خود ووٹ نہ ڈال سکے۔ اس طرح ہزار ہا تعلیم یافتہ افراد کو حق رائے دہی سے محروم کر دیا گیا' جبکہ عوامی نمائندے چننے میں اکثریت غیر تعلیم یافتہ لوگوں ہی کی تھی۔ معلوم ہوا کہ پوری قومی مشینری میں تعلیم کی اہمیت کو سرا سر ختم کیا جا رہا ہے۔ جب تعلیم اور تعلیم یافتہ افراد معاشرے میں اس درجے بے وقار ہیں تو نئی نسل تعلیم کے حصول میں اپنی توانائیاں کیوں ضائع کرے گی!

ضرورت اس بات کی تھی کہ صحیح اسلامی اقدار کی تشہیر و اشاعت کی جاتی اور اس طرح نوجوان نسل اپنے دین کی طرف سے عائد کردہ فرائض سے روشناس ہونے کے علاوہ انسانیت کے تقاضوں سے بھی آگاہ ہوتی' کیونکہ اسلام دین فطرت ہے' کوئی اسلامی تقاضا ایسا نہیں ہے جو قوانینِ فطرت سے ٹکراتا ہو۔ لیکن ہوا یہ کہ جدید تہذیب نے جس قدر برائیاں

چمکا دمکا کر پیش کیں اخلاقی قدروں کی اشاعت اُس سے کم تر رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نوجوان نسل ظاہری چمک دمک میں پڑ گئی اور آخرت کو فراموش کر بیٹھی۔ اس وقت پورا معاشرہ دولت کمانے کے چکر میں پڑ گیا ہے اور ہر شخص زیادہ سے زیادہ دنیاوی راحت کا سامان اکٹھا کرنے میں لگ گیا ہے۔ شادی بیاہ اور دوسری سماجی تقریبات پر بھاری اخراجات کے ساتھ نمود و نمائش کے لیے چمک دمک کا منظر پیش کیا جانے لگا ہے۔ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی ہر شخص دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں ہے۔ قرآن کا حکم تو یہ ہے: ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ ''نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرو''، لیکن افسوس کہ یہاں نمود و نمائش، تصنع اور فضول خرچی کے کاموں میں سبقت لے جانے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ معاشرہ جب مجموعی طور پر چمک دمک پر فدا نظر آ رہا ہے تو نوجوان نسل تو پہلے ہی ناپختہ ذہن رکھتی ہے، لہٰذا اُن کا سحر زدہ ہونا یقینی ہے۔

یہاں علماء کی ذمہ داری تھی کہ وہ صحیح اسلامی تعلیمات کی روشنی میں قناعت کا درس دیتے اور خود اپنی زندگیوں سے قناعت پسندی کا ثبوت دیتے، مگر علماء اس کام میں ناکام رہے، اِلّا ماشاءَ اللہ۔ واعظین، مبلغین اور خطباء خود آسائش پسند ہو گئے۔ زبان سے قناعت پسندی کی تعلیم دینے والے بھی قناعت سے کوسوں دور چلے گئے۔ سچ پوچھئے تو علماء کا کام تھا دعوت الی الخیر اور نہی عن المنکر، مگر خود علماء فرقہ بندی کے چکر میں پڑ گئے اور سادہ لوح عوام کو ایک دوسرے سے متنفر کرنے کا فریضہ سنبھال لیا۔ جب نئی نسل نے واعظین اور علماء کو آپس میں ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہتے سنا تو اس کے ذہن میں تحقیق و جستجو کی بجائے خود اسلام ہی سے نفرت پیدا ہو گئی۔ حالانکہ علماءِ دین کو اسلام کی کسوٹی سمجھنا بذاتِ خود غلطی ہے۔ ہاں علماء کی وہ جماعت ہمیشہ سے قابل قدر رہی ہے اور اب بھی قابل قدر ہے جو ہر قسم کے حالات میں قرآن و سنت کی تعلیمات کی اشاعت و تبلیغ کے لیے کمر بستہ رہی اور نبی اکرم ﷺ کے اُسوۂ حسنہ پر عمل پیرا رہی۔ اب اگر کہیں اسلامی اقدار کی تھوڑی بہت ترویج نظر آتی ہے تو وہ انہی کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ بہرحال نام نہاد علماء کے ناپسندیدہ طرزِ عمل نے نئی نسل کو متأثر کیا اور یوں نئی نسل راہِ راست سے منحرف ہوئی۔

اگر علماء مسلک کے اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کا احترام کرتے، جیسا کہ خود جلیل القدر ائمہ و فقہاء آپس میں ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے، تو نفرت کے پیدا ہونے کا امکان نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر علماء دیانت داری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق رسول

اللہ ﷺ کی زندگی کو اپنے لیے اسوۂ حسنہ سمجھ کر اپناتے اور اسے دوسروں کے سامنے پیش کرتے تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔ لہٰذا نئی نسل کی تباہی کی بہت بڑی ذمہ داری اُن علمائے کرام پر بھی عائد ہوتی ہے جنہوں نے اسلام کے عالم گیر اور سادہ طرزِ زندگی کی اشاعت کو چھوڑ کر اور فقہی اختلاف کو ہوا دے کر مسلمان کو مسلمان سے نفرت دلانے بلکہ نوجوانوں کو اسلام سے متنفر کرنے کا گھناؤنا کام اختیار کر رکھا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرے کے تمام افراد قوم وملت کی خیر خواہی کے ساتھ اپنا محاسبہ کریں، طرزِ عمل بدلیں اور وہی کام کریں جو اسلامی اور اخلاقی تقاضوں کے مطابق ہوں، نیز نوجوانوں کے لیے مثبت کردار کا نمونہ بنیں۔ oo

1

شفاعت کا شرعی مفہوم

اشفاق الرحمٰن خان

شفاعت کا لفظ ''شفع'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی جفت یعنی دو کے ہیں۔ شفاعت کرنے والا حاجت مند کی درخواست پیش کرنے کے موقع پر حاجت مند کو اکیلا نہیں رہنے دیتا' بلکہ حاجت مند اور شفاعت کرنے والا دو ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ مشفوع الیہ (جس کے حضور شفاعت کی گئی ہے) کو بھی ''شفع'' کر دیتا ہے' کیونکہ اس کی شفاعت کی وجہ سے مشفوع الیہ مطلوبہ فعل کا فاعل بن جاتا ہے۔ اس طرح اس نے طالب اور مطلوب دونوں کو ''شفع'' کر دیا۔ اللہ تعالیٰ چونکہ وتر (اکیلا) ہے' اس کو شفع نہیں کیا جا سکتا' اس لیے اس کے پاس بلا اجازت شفاعت کوئی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اختیار سارے کا سارا اُسی کے ہاتھ میں ہے اور کسی بھی لحاظ سے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آیت الکرسی میں اس کی نفی کر دی ہے اور یہ آیت توحید کے بیان پر مشتمل ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ﴾ (البقرۃ:۲۵۵)

''جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے سب اُسی کا ہے۔ کون ہے جو اُس کے پاس بلا اجازت شفاعت کر سکے؟''

سید الشفعاء حضرت محمد ﷺ قیامت کے دن سجدہ کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کریں گے تو آپ ؐ سے کہا جائے گا: ''سر اٹھایئے' بات کیجیے' سنی جائے گی۔ طلب کیجیے' دیا جائے گا۔ شفاعت کیجیے' مانی جائے گی''۔ چنانچہ آپ ؐ کے لیے ایک حدّ مقرر کی جائے گی اور آپ ؐ اُن لوگوں کو جنت میں داخل کر دیں گے۔ یعنی بات وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمائی:

﴿قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ﴾ (آل عمران:۱۵۴)

''کہہ دیجیے حکم سب اللہ کا ہے''۔

اور فرمایا:

﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ﴾ (الاعراف:٥٤)

''خبردار! تخلیق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے۔''

تو اللہ کے پاس کوئی شخص شفاعت نہیں کرسکتا مگر اُسی کی اجازت سے اور وہ جسے چاہتا ہے اجازت دیتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہیے کہ شفاعت مطلق نہیں ہے' بلکہ اُسی کے لیے ہوگی جس کے لیے اجازت دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهُ﴾ (سبأ:٢٣)

''اُس کے ہاں شفاعت کوئی فائدہ نہیں دیتی مگر جس کے لیے وہ اجازت دے''۔

اور فرمایا:

﴿يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴿١٠٩﴾﴾ (طٰہٰ)

''اُس دن شفاعت فائدہ نہیں دے گی مگر جس کے لیے رحمٰن اجازت دے اور اس کی بات کو پسند کرے۔''

آیتِ مبارکہ کا مطلب ہے کہ جس کے لیے شفاعت کرنا مطلوب ہے اس کے لیے شفاعت کرنے کی کسی کو اجازت دی جائے۔ مطلق شفاعت کی کسی کو اجازت نہیں' بلکہ ان مخصوص افراد کے لیے شفاعت کی اجازت ہوگی جن کے لیے شفاعت کرنے کی اللہ اجازت دے گا۔ بہت سے مفسرین کرام نے اس سے یہ اخذ کیا ہے کہ شفاعت صرف مؤمنوں کو فائدہ دے گی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''اس سے مراد لا الٰہ الّا اللہ (کا ماننے والا) ہے''۔

امام بغوی فرماتے ہیں:

''اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر مؤمن کے لیے شفاعت نہیں ہوگی''۔

مقصودِ کلام یہ ہے کہ شفاعت کے لیے ضروری ہے کہ ایک شافع (شفاعت کرنے والا) ہو اور ایک مشفوع لہٗ (جس کے حق میں شفاعت کی جائے) ہو۔ شفاعت کے لفظ میں ہر شفاعت کرنے والے کی شفاعت شامل ہے' اسی طرح مشفوع لہٗ کے لیے ہونے والی ہر

شفاعت شامل ہے۔ تو جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ﴾ ''اُس دن شفاعت فائدہ نہیں دے گی'' تو اس سے دونوں قسموں کی نفی ہوگئی' شفاعت کرنے والے کی شفاعت کی بھی اور گنہگاروں کے لیے شفاعت کی بھی۔ پھر جب فرمایا: ﴿اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ﴾ ''مگر جس کے لیے رحمٰن اجازت دے'' تو اس میں دونوں قسمیں آ گئیں' یعنی جس شفاعت کرنے والے کو اللہ نے اجازت دی اور اس کی بات پسند فرمائی اور جس مشفوع لہٗ کے حق میں اللہ نے اجازت دی اور اُس کے حق میں کی جانے والی بات پسند فرمائی۔ یہ شفاعت مشفوع لہٗ کو یہ فائدہ دے گی کہ اسے عذاب سے نجات دلوا دے گی اور شافع کو اس انداز سے فائدہ دے گی کہ اس کی شفاعت قبول ہونے سے اس کی عزت افزائی ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے محمد رسول اللہ ﷺ کی سب سے زیادہ جو عزت افزائی فرمائے گا وہ شفاعت ہے جو آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہی ''مقامِ محمود'' ہے' جس مقام پر فائز ہونے پر سب اگلے پچھلے انسان نبی اکرم ﷺ کی تعریف کریں گے۔

ایک صحیح حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يَا بَنِىْ عَبْدِ مَنَافٍ اشْتَرُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ اللّٰهِ' يَا بَنِىْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ اشْتَرُوْا اَنْفُسَكُمْ مِنَ اللّٰهِ' يَا اُمَّ الزُّبَيْرِ بْنِ الْعَوَّامِ عَمَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ' يَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ اشْتَرِيَا اَنْفُسَكُمَا مِنَ اللّٰهِ لَا اَمْلِكُ لَكُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا سَلَانِىْ مِنْ مَالِىْ مَا شِئْتُمَا)) (۱)

''اے عبد مناف کی اولاد! اپنے آپ کو اللہ کے غضب سے بچا لو! اے عبد المطلب کی اولاد! اپنے آپ کو اللہ کے غضب سے بچا لو! اے اللہ کے رسول کی پھوپھی اُمّ زبیر! اے محمد کی بیٹی فاطمہ! تم دونوں اپنے آپ کو اللہ کے غضب سے بچا لو! میں تمہارے لیے اللہ کے غضب سے بچانے کے لیے کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ تم میرے مال میں سے مجھ سے جو چاہو مانگ لو!''

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا اُلْفِيَنَّ اَحَدَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ شَاةٌ لَهَا ثُغَاءٌ' عَلٰى رَقَبَتِهٖ فَرَسٌ لَهٗ حَمْحَمَةٌ يَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغِثْنِىْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ' وَعَلٰى رَقَبَتِهٖ بَعِيْرٌ لَهٗ رُغَاءٌ يَقُوْلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَغِثْنِىْ فَاَقُوْلُ لَا

(۱) صحیح البخاری' کتاب المناقب' باب من انتسب الی آبائه فی الاسلام و الجاهلیة!

اَمْلِکُ لَکَ شَیْئًا قَدْ اَبْلَغْتُکَ' وَعَلٰی رَقَبَتِهٖ صَامِتٌ فَیَقُوْلُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَغِثْنِیْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِکُ لَکَ شَیْئًا قَدْ اَبْلَغْتُکَ' اَوْ عَلٰی رَقَبَتِهٖ رِقَاعٌ تَخْفِقُ فَیَقُوْلُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ' اَغِثْنِیْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِکُ لَکَ شَیْئًا قَدْ اَبْلَغْتُکَ)[1]

''میں قیامت کے دن تم میں سے کسی کو ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ اس کی گردن پر ممناتی بکری یا ہنہناتا گھوڑا سوار ہو اور وہ شخص مجھ سے کہتا ہو یارسول اللہ (ﷺ)! میری فریاد رسی کیجیے اور میں کہہ دوں کہ آج میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا' میں نے حکمِ الٰہی تم کو پہنچا دیا تھا۔ یا اس کی گردن پر بلبلاتا اونٹ سوار ہو اور وہ شخص مجھ سے کہے یارسول اللہ (ﷺ)! میری فریاد رسی کیجیے اور میں کہہ دوں کہ آج میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا' میں نے تم کو حکمِ الٰہی پہنچا دیا تھا۔ یا اس کی گردن پر سونا چاندی لدا ہوا ہو اور وہ مجھ سے کہتا ہو یارسول اللہ (ﷺ)! میری فریاد رسی کیجیے اور میں کہہ دوں کہ آج میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا' میں نے تم کو حکمِ الٰہی پہنچا دیا تھا۔ یا اس کی گردن پر ہلتے ہوئے کپڑے لدے ہوں اور وہ کہہ رہا ہو یارسول اللہ (ﷺ)! میری فریاد رسی کیجیے اور میں کہہ دوں کہ آج میں تمہارے کام نہیں آ سکتا۔ میں نے تم کو حکمِ الٰہی پہنچا دیا تھا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ فرمانِ الٰہی ﴿لَا یَمْلِکُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ﴾ ''وہ اُس کے سوا کسی سے شفاعت کے مالک نہیں ہوں گے'' اور ﴿لَا یَمْلِکُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿۳۷﴾ ...... لَّا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾﴾ (النبأ) ''جس کے سامنے کسی کو بولنے کا یارا نہیں ......کوئی نہ بولے گا مگر جس کے لیے رحمٰن نے اجازت دی اور اُس نے صحیح بات کی (اور پسند کیا اس کے لیے بات کرنا)'' میں دونوں جگہ اجازت کی شرط لگائی گئی ہے' یعنی جو بھی صحیح بات کرے گا اللہ اس کی بات سے راضی ہوگا (یعنی جس کو اجازت دی جائے گی اور جس کے لیے اجازت دی جائے گی)۔

چنانچہ قرآن حکیم اور احادیث رسول ﷺ کی روشنی میں یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ایمان والوں کے لیے شفاعت ہوگی جنہوں نے صدقِ دل سے کلمہ پڑھا ہوگا اور اپنے ایمان میں شرک کو نہیں ملایا ہوگا۔

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب الغلول وقول اللّٰہ تعالیٰ ﴿وَمَنْ یَّغْلُلْ یَاْتِ بِمَاغَلَّ﴾

1

افکار و آراء

توہینِ رسالت کے حقیقی اسباب
اور
مسلمانوں کے لیے راہِ عمل

محمد منیر احمد☆

بدقسمتی سے ہم مسلمان اپنے مسائل جان لینے کے باوجود بھی ان کے اسباب کو سمجھنے اور اُن سے عہدہ برآ ہونے کی سنجیدہ کوشش نہیں کرتے۔ اسی لیے ہمارے مسائل کا کوئی مستقل حل نہیں نکلتا۔ یہی اس وقت توہینِ رسالت کے معاملے میں ہوتا نظر آ رہا ہے۔ اس مسئلے کی تاریخ اور اسباب نیز اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے راہِ عمل اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ کی آیات ۱۰۴ تا ۱۰۹ میں بیان فرما دیا ہے۔ اس مضمون میں انہی آیات کے تناظر میں بات ہو رہی ہے۔ اگر کسی صاحب کو اس مضمون کے حوالے سے کوئی پریشانی ہو تو وہ مذکورہ آیات کا بغور مطالعہ کریں۔

تاریخ

قرآن کریم سے ثابت ہے کہ اہل کتاب نبی اکرمﷺ کی مجالس میں بیٹھ کر بھی آپؐ کی توہین کرتے تھے۔ وہ اس طرح کہ جب مدینہ میں رسول اللہﷺ قرآن کریم کے کسی حصہ کے نزول کے بعد مسلمانوں کو اللہ کی یہ وحی سناتے اور سکھاتے تھے تو انصارِ مدینہ اپنی پرانی قرابتوں کی بنا پر یہود کو بھی دعوت دیتے تھے اور اُمید رکھتے تھے کہ اہل کتاب ہونے کی بنا پر انہیں یہ بات جلد سمجھ آ جائے گی۔ نبی اکرمﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا طریقہ یہ تھا کہ جب اس سیکھنے سکھانے کے دوران کسی صحابیؓ کو نبیﷺ سے کوئی بات پوچھنی ہوتی تو وہ آپؐ کو بڑی عزت سے مخاطب کرتا اور کہتا ''یَارَسُوْلَ اللّٰہِ رَاعِنَا '' یعنی اے اللہ کے رسول، ہماری

☆امیر تنظیم اسلامی، حلقہ بہاولنگر و بہاولپور

رعایت فرمائیں! آپؐ رک کر اسے سمجھاتے اور پھر آگے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے۔ وہاں بیٹھے ہوئے اہل کتاب کو یہ تعلیمی سلسلہ اچھا نہیں لگتا تھا لہٰذا معلمﷺ اور طالب علموںؓ کے بارے میں اُن کے دل میں بغض پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ رسول اللہﷺ سے خواہ مخواہ سوالات پوچھتے تاکہ آپؐ کا وقت ضائع ہو' یہاں تک کہ بیٹھے ہوئے انصارِ مدینہ بھی بیزار ہو کر گھروں کو جانے لگیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح یہ تعلیم زیادہ نہیں پھیل سکے گی اور ہم پر کوئی الزام بھی نہ ہوگا۔ لیکن جب وہ سوال پوچھنے کے لیے نبیﷺ کو مخاطب کرتے تو ''یَارَسُوْلَ اللّٰہِ رَاعِنَا'' کی جگہ ''یَارَسُوْلَ اللّٰہِ رَاعِیْنَا'' کہہ کر مخاطب کرتے۔ رَاعِنَا اور رَاعِیْنَا کے تلفظ میں تو معمولی سا فرق ہے جسے ہر ایک محسوس نہیں کر سکتا' لیکن دونوں کے مطالب میں فرق یہ ہے کہ ایک عزت والا لفظ ہے تو دوسرا توہین والا۔ جب کوئی اُن سے اس بارے میں پوچھتا کہ یہ تم نے کیا لفظ ادا کیا ہے؟ تو وہ جھوٹ بول دیتے کہ ہم نے رَاعِنا ہی کہا ہے' تمہارے سننے میں غلطی ہے۔

اسباب

اول: علم و ہنر بڑی دولت ہے' لیکن اگر انسان کو اللہ کی حفاظت حاصل نہ ہو تو علم کے ساتھ تکبر بھی انسان کے دل میں جگہ بنا لیتا ہے۔ ایسا انسان اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھتا ہے۔ پھر اپنی نسل اور اپنے ہم مسلکوں کو ہی سب خوبیوں کا حامل سمجھتا ہے۔ یہی وہ موقع ہوتا ہے کہ وہ اچھی چیز کو قبول کرنے کی توفیق سے محروم ہو جاتا ہے' بلکہ وہ کسی اچھی چیز کی جانب توجہ پر بھی آمادہ نہیں ہوتا۔ اہل کتاب اس بیماری میں پوری طرح مبتلا تھے۔ وہ اہلِ کتاب ہونے کی بنا پر اپنے آپ کو برتر سمجھتے تھے۔ اُن کے نزدیک تورات سے بہتر کتاب اور بنی اسرائیل کے پیغمبروں سے بہتر پیغمبر کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے نبی اکرمﷺ پر اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح فرما دی کہ اہل کتاب آپؐ سے صرف اُس وقت خوش ہو سکتے ہیں جب آپ ان کے دین کو اختیار کر لیں۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَلَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَھُوْدُ وَلاَ النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَھُمْ﴾(البقرۃ: ۱۲۰)

دوم: اہل کتاب کو یقین تھا کہ نہ محمد (ﷺ) ہمارا دین اختیار کریں گے اور نہ ہم ان کے دین میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ان کی زبان عربی تھی۔ وہ یہ جانتے تھے کہ قرآن ایک پروگرام بیان کرتا ہے اور محمد (ﷺ) اس پروگرام ہی کی تکمیل کر رہے ہیں' اور اگر یہ پروگرام

کامیاب ہو گیا تو ہم مدینہ چھوڑ کر عرب میں کسی جگہ بھی نہ رہ سکیں گے۔ لہٰذا وہ اصلاً قرآن یعنی اس پروگرام کے دشمن تھے۔ یہی مشکل مشرکین مکہ کی بھی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی عمر شریف کے پہلے چالیس سال میں مکہ والوں کی جانب سے مثالی عزت پائی۔ یہ عزت کسی جاگیر‘ سرمایہ یا عہدہ کی بنیاد پر نہ تھی‘ بلکہ یہ عزت آپؐ نے اپنے کردار کی بنیاد پر حاصل کی تھی۔ لیکن قرآن کریم کے نزول کے ساتھ ہی حالات برعکس ہو گئے۔ چنانچہ قرآن نبی اکرم ﷺ اور مکہ والوں کے درمیان ایک بڑا مسئلہ بن گیا۔ وہ نبی ﷺ سے مطالبہ کرنے لگے کہ اس قرآن کی جگہ دوسرا قرآن لاؤ یا اس میں ترمیم کرو۔ (یونس:۱۵) لیکن جب انہیں یقین ہو گیا کہ یہ مطالبہ پورا نہ ہو گا تو یہود کی طرح دوسرے کافروں سے کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) سے یہ قرآن نہ سنو‘ اگر سنا رہے ہوں تو شور وغل کر کے مجلس خراب کر دو تاکہ تم غالب ہوسکو۔ (حٰمٓ السجدة:۲۶) یعنی نبی اکرم ﷺ کو یہ قرآنی پروگرام لوگوں کے سامنے پیش کر کے اپنے ساتھ ملانے سے روک سکو۔ سورۃ البقرۃ‘ آیت ۱۰۴ میں اہل کتاب کی جانب سے آپ ﷺ کی توہین کرنے کا تذکرہ ہے اور آیت ۱۰۵ میں اس توہین کی وجہ بیان کر دی گئی ہے:

﴿مَا یَوَدُّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَلَا الۡمُشۡرِکِیۡنَ اَنۡ یُّنَزَّلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ؕ﴾

یعنی مشرکوں اور ان اہل کتاب سے دراصل تم پر تمہارے ربّ کی طرف سے اس خیر یعنی قرآن حکیم کا نازل ہونا برداشت نہیں ہوتا۔ یہاں قرآن کا صفاتی نام ''خیر'' آیا ہے۔ خود نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ خَیۡرَ الۡحَدِیۡثِ کِتَابُ اللّٰہِ)) ''یقیناً بہترین بات اللہ کی کتاب ہے''۔

سورۂ آل عمران‘ آیت ۱۱۰ میں اس خیر بن کر نازل ہونے والے قرآن کی حامل اُمت کو ''خیر اُمت'' قرار دیا گیا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ پروگرام اکیلے ہی شروع کیا تھا لیکن جب آپؐ کا یہ قرآنی پروگرام مکمل ہوا تو لاکھوں انسانوں پر مشتمل ایک ملک وجود میں آ چکا تھا۔ آپؐ اس ملک کے پہلے حکمران تھے۔ اس ملک میں مشرکوں کے رہنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ البتہ جو بھی اللہ کے دین کو قبول کرنے والا تھا اس کے لیے یہ ملک دنیا میں جنت تھا۔ چونکہ یہود ونصاریٰ کو صرف مسلمانوں کے مرکز سے نکالنے کا حکم تھا لہٰذا جب مسلمانوں کا اقتدار جزیرہ نمائے عرب

سے باہر تک پھیلا تو یہ ان علاقوں میں پُرامن اقلیت کے طور پر رہنے لگے۔ یہ سب کچھ تاریخ کا حصہ ہے اور اہل کتاب اسے کبھی نہیں بھول سکتے' خواہ ہم اپنی صفائی میں کتنی ہی میراتھن دوڑیں لگائیں یا روشن خیالی کی سند کے طور پر ناچ ناچ کر کہیں ؎

''میرے اسلام کو اِک قصۂ ماضی سمجھو!''

ان اہل کتاب کی بدقسمتی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم یعنی اس قرآنی پروگرام کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے اور سورۃ الاحزاب میں فیصلہ سنا دیا ہے کہ ''(اے مسلمانو!) تمہارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی بہترین نمونہ ہے جو بھی (تم میں سے) اللہ کے پاس حاضری کا یقین رکھتا ہے''۔ (آیت ۲۱) چنانچہ اہل کتاب نے سازشوں کے ذریعے پہلے تو اُس نظامِ حکومت کا خاتمہ کیا جو دنیا کے لیے ایک نمونہ تھا۔ اور جہاں کہیں بھی ایسا نمونہ سامنے آنے کے امکان پیدا ہوں اس کا خاتمہ ان کی پہلی ترجیح ہوتا ہے۔ اس قرآنی پروگرام کی طرف باقی مسلمانوں کی توجہ مبذول کرانے والوں کو وہ بنیاد پرست اور اپنا بڑا دشمن خیال کرتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کے فرمان میں یہ بات موجود ہے کہ قیامت سے پہلے پوری زمین پر اللہ کا دین غالب ہوگا۔ اس غلبہ کے وقت یہود و نصاریٰ ایک اقلیت ہوں گے جو جزیہ دے کر اپنے پُرامن اقلیت ہونے کا ثبوت دیں گے۔ اہل کتاب کے لیے یہ ایک خوفناک خواب ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو قرآن کریم سے دور کرنا اور اس قرآنی پروگرام پر سب سے پہلے عمل کرنے والے رسول ﷺ اور اس رسولؐ کی زندگی کو نمونہ بنانے کی خواہش رکھنے والوں کو بے توقیر کرنا ان کا اوّلین ایجنڈا ہے۔ اسی ایجنڈے کے تحت طالبان کی حکومت ختم کی گئی اور پاکستان کے سکولوں کے نصاب سے قرآنی آیات خارج کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

راہِ عمل

عجیب ستم ظریفی ہے کہ اس قرآنی پروگرام کے دشمن تو پوری منصوبہ بندی سے اسے ناکام بنانے کے لیے کام کرتے ہیں' لیکن مسلمان اس پروگرام کو کامیاب کرنے کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں رکھتے۔ اس سے بڑا ستم یہ ہے کہ ہمارے دشمن ہمیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر لیتے ہیں' جس کی قریبی مثال یہ ہے کہ ہم نے پہلے تو افغانستان کو ایک غیر مسلم قوت سے آزاد کرانے کے لیے مسلمان افغان بھائیوں کی مدد کی' آزادی کی اس جنگ میں ۵۰ لاکھ مسلمانوں کی جانیں قربان ہوئیں' لیکن پھر ہم ان ہی افغان مسلمانوں کو امریکہ کا غلام بنوانے

کے لیے امریکہ کے ساتھی بن گئے۔ چنانچہ لاکھوں مسلمانوں کی جانیں اور عزتیں ایک بار پھر لٹنے کے ساتھ ساتھ ایک خالص اسلامی حکومت کا خاتمہ ہوا اور پاکستان کے ہوائی اڈے اور بندرگاہیں امریکی قبضہ میں چلی گئیں۔ اس کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جو دین دار طبقے افغانستان کو روس کے چنگل سے آزاد کرانا ہی اصل دینی فریضہ سمجھتے تھے آج اپنے ملک کو امریکہ کے قبضہ میں جاتا دیکھ کر بھی کسی منصوبہ بندی کے ساتھ کام کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ چوروں‘ ڈاکوؤں‘ ملاوٹ کرنے والوں‘ کم تولنے والوں‘ سود خوروں‘ رشوت خوروں‘ ظالموں‘ حرام خوروں‘ زانیوں‘ شرابیوں‘ گھروں میں پردہ نہ کرانے والوں‘ بہنوں بیٹیوں کو اللہ کے دیے حق وراثت سے محروم کرنے والوں‘ غرضیکہ اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی کو اپنے لیے نمونہ نہ بنانے والوں کو تو نہ کوئی مسلک پرست اپنے مسلک سے خارج کرتا ہے‘ نہ ان کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے اس کی نماز میں کوئی قباحت واقع ہوتی ہے اور نہ ان کے ساتھ رشتہ داری کرتے وقت ان کی کوئی چیز اسے قرآن وسنت سے ہٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن جب بھی خالصتاً اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے کوئی اجتماع ہو‘ خواہ وہ نماز ہی کے لیے کیوں نہ ہو‘ تو ان کا مسلک ان کے لیے یہودیوں کی طرح رکاوٹ بن جاتا ہے۔ کبائر سے بھی درگزر کرنے والے ان مؤمنوں میں یہاں آ کر درگزر سرے سے ختم ہو جاتی ہے۔

ان بیماریوں سے شفا حاصل کرنے‘ شریعت محمدیؐ کے دوبارہ وجود میں لانے یا صحیح تر الفاظ میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی توہین کا بدلہ لینے کے خواہش مند ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ پورے قرآن کو نبی اکرم ﷺ کے اس ۲۳ سالہ نمونے کی روشنی میں پہلے خود سمجھے اور پھر یہی چیز دوسروں کو سمجھائے۔ قرآن کو سمجھ جانے والے یہ لوگ پھر ایک ایسی جماعت کی شکل اختیار کر جائیں جس کا ہر رکن خود قرآن کا زندہ نمونہ ہو اور اُن کے گھر بھی قرآن کا نمونہ ہوں۔ پھر وہ ایسی قوت بنیں جس کے ساتھ اللہ کی مدد ہوتی ہے۔ اس قوت کا کون انکار کر سکتا ہے جس کے لیے خود رسول اللہ ﷺ نے دعا کی کہ اے اللہ! اگر تو اس قرآنی پروگرام کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہے تو عمرو بن ہشام (ابوجہل) یا عمر بن خطاب میں سے کسی ایک کو ضرور ایمان کی توفیق دے دے۔ یہ مکہ کے دو باہمت انسان تھے جو دونوں رسول اللہ ﷺ کے انتہائی دشمن تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں میں سے ایک کو ایمان کی توفیق دے دی۔ لہٰذا سمجھ لینا چاہیے کہ یہ بہت بڑا پروگرام ہے جو باہمت اور باکردار لوگوں کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔

اگر کوئی خوش بخت اس کے لیے کھڑا ہوا تو وہ دراصل نبی اکرم ﷺ کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے کھڑا ہو گا جس کا اظہار نبی ﷺ کی مذکورہ بالا دعا میں ہوا ہے۔

ہماری پہلی ترجیح یہ ہونی چاہیے کہ یہ قرآنی پروگرام میری ذات' میرے گھر' میرے محلے اور شہر سے ہوتا ہوا پاکستان بھر میں نافذ ہو جائے اور پھر اسی طرح آگے بڑھے جیسے نبی ﷺ کے بعد خلفائے راشدین کے دَور میں بڑھا تھا۔ ہمارے لیے تو یہ حجت موجود ہے کہ حکومت کالا باغ ڈیم بنانا چاہتی تھی لیکن انسانوں ہی کی مزاحمت نے اسے اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ میراتھن ریس میں نیم عریاں عورتیں لاہور کی سڑکوں پر اس لیے دوڑتی رہیں کہ یہ غریب دین کا معاملہ تھا اور دین کے لیے اتنی مزاحمت کرنے والے باہمت لوگ موجود نہیں تھے۔ ہمیں اس کے لیے صبر سے کام لینا ہو گا اور مسلسل اپنے پروگرام کو آگے بڑھانا ہو گا یہاں تک کہ ہم اس قابل ہوں کہ اللہ کی مدد بھی ہمارے ساتھ ہو۔ یہی بات سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۰۹ میں کہی گئی ہے:

﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ﴾

یعنی اے نبیؐ! ان توہین کرنے والوں سے درگزر کریں' ان کی باتوں کو نظر انداز کریں' یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ جائے۔ ظاہر ہے اللہ کے حکم کے آنے میں دیر کیا تھی! دیر تو دراصل اس مطلوبہ جماعت یا قوت کے وجود میں آنے میں تھی جس کے ذریعے نبی ﷺ نے اس پروگرام کو کامیاب کیا۔ اس پروگرام کی کامیابی ہی توہین رسالت کا اصل بدلہ ہے۔ یہی ہمارا فرض ہے اور اس کام کا نہ کرنا خود اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی توہین ہے کہ ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ یعنی تمہارے لیے اللہ کے رسول (ﷺ) کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ ہم میں کتنے ایسے مسلمان ہیں جو خود اس توہین کے مرتکب نہیں ہو رہے ہیں؟

طائرانِ فلک اور اشرف المخلوقات

محمد ابوبکر احمد

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر ذی روح کو اپنی جان سے بڑھ کر کوئی چیز پیاری نہیں ہوتی۔مگر اولاد ایسی نعمت ہے جو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز اور مقدم ہوتی ہے۔اپنے بچے اپنی جان کے ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں۔کچھ عرصہ قبل ایک واقعہ نظروں سے گزرا کہ ایک درخت پر سے ایک شارک کا نومولود بچہ گر گیا۔کچھ دُور ایک کتا اس کی گھات میں بیٹھا ہوا تھا۔شارک کی ممتا جاگ اٹھی اور اس نے اس طریقے سے واویلا مچایا کہ اس کی دلدوز پکار سن کر باقی شارکیں بھی اکٹھی ہوگئیں۔کتے کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے' اس کی ساری جرأت خاک میں مل گئی۔شارکیں اس بچے کے گرد اکٹھی ہوگئیں۔ان کی چیخ و پکار سن کر لوگ بھی متوجہ ہو گئے' کوے بھی ساتھ دینے کو تیار ہوگئے۔جب تک بچہ اپنے گھونسلے میں نہیں پہنچ گیا' انہوں نے حصار نہیں توڑا۔

آج میری آنکھوں نے خود اِس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ کھلے صحن میں مرغیاں چوزوں کے ساتھ دانہ دُنکا چگنے میں مصروف ہیں کہ بلی ایک چوزے پر حملہ آور ہوتی ہے۔بلی کو دیکھتے ہی مرغیوں نے حلق سے عجیب سی آوازیں نکالنا شروع کر دیں۔وہ یک لخت اپنی جان ہتھیلی پر لیے بلی کی طرف لپکتی ہیں اور اپنی ننھی ننھی چونچوں سے بلی کا مقابلہ کر کے زخمی ہو کر بھی چوزے کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں اور اسے پروں میں چھپا کر فتح کا اعلان کر دیتی ہیں۔

جی ہاں! یہ تھے طائرانِ فلک جو اشرف المخلوقات کے نزدیک نہایت کم عقل' کمزور اور نحیف تصور کیے جاتے ہیں۔ان کی مربوط اور منظّم حکمت عملی دیکھ کر میرے چلتے قدم فوراً رک گئے' دل ماہئ بے آب کی طرح بے تاب ہو گیا اور جہاں زبان سے خدائے بزرگ و برتر کی تکبیر جاری ہوگئی وہاں ساتھ ہی آنکھوں سے احساسِ ندامت کے آنسو ٹپک پڑے۔میں سوچ میں پڑ گیا اور پھر میں نے اپنے آپ کو جو اشرف المخلوقات ہونے کا دعوے دار ہے اور اس کمزور سی مخلوق کو ترازو کے دو پلڑوں میں رکھ دیا' مگر مجھے اپنا پلہ کہیں اوپر اٹھتا دکھائی دیا۔ایک طرف وہ مخلوق جس کے پاس زبان ہے نہ قلم' ملک ہے نہ اقتدار' طاقت ہے نہ ہتھیار' وہ کتنی دیدہ دلیری کے ساتھ نہ صرف اپنا دفاع کرتی ہے بلکہ مدّ مقابل کو ناکوں چنے چبوا دیتی ہے۔وہ اس مقصد کی خاطر نہ تو کسی ٹیکنالوجی کا انتظار کرتی ہے' نہ اکیلے پن کا رونا روتی ہے' نہ

کمزوری کا بہانہ بناتی ہے اور نہ ہی وقت اور حالات کے تقاضوں سے شکست خوردہ ہوتی ہے۔ دوسری طرف ہم ہیں کہ سوا ارب کی تعداد میں' معدنی وسائل سے مالا مال' جدید ترین ایٹمی ٹیکنالوجی اور بہترین سپاہ والے چھپن ملکوں کی حکومت رکھتے ہیں۔ دنیا کا ایک تہائی زرِمبادلہ ہمارے ہاتھ میں ہے' مگر پھر بھی اتنے نحیف اور کمزور ہیں' اتنے لاغر اور بے بس ہیں کہ ہمارے جیتے جاگتے ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے اس مکرم و معظم نبی ﷺ کی حرمت پامال ہوئی۔ ان کے بے ہودہ کارٹونز بنائے گئے کہ جن کے بارے میں ہم دعوے دار ہیں کہ وہ ہمیں ہماری جان و مال' اولاد اور دنیا کی ہر نعمت سے محبوب تر ہیں۔ نہ جانے کس کس انداز میں ان کا تمسخر اڑایا گیا کہ جسے بیان کرنے کی میری زبان اور قلم میں سکت نہیں (العیاذ باللہ)۔ اور پھر اتنی ڈھٹائی کہ ان تصاویر کو صفحاتِ اوّل پر ایک بار نہیں سہ بار شائع کیا گیا' لیکن ہمارے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور ہم میں سے کسی کے معمولاتِ زندگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ آج بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کا چلن ہے' زندگی قہقہوں اور رقص و سرود کی نذر ہے۔ کسی کی رات کی نیند اور دن کا سکون برباد نہیں ہوا' کسی کے کاروبارِ حیات میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا' کسی کے حواس پر سکتہ طاری نہیں ہوا' کسی کا دماغ منجمد نہیں ہوا اور دل خون کے آنسو نہیں رویا۔ ہم تو بڑے حساس دل تھے کہ تھوڑا سا ٹیکس یا بل زیادہ آجائے تو ہارٹ اٹیک ہو جایا کرتا ہے' مہنگائی سے دو چار فاقے کاٹنے پڑ جائیں تو خودکشی پر اُتر آتے ہیں' معمولی سی خلافِ طبع بات پر کشت و خون پر تل جاتے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا یا الٰہی! اب کیا ماجرا ہو گیا کہ پہلے تو ظلم کے پہاڑ ہمارے اوپر ڈھائے جا رہے تھے اور اب دنیا بھر کا کفر سرورِ کونین ﷺ کی ناموس کے درپے ہے؟ مجھے تو اپنی ساری طاقت' ولولے اور جذبے ان تلاطمِ خیز موجوں کے سپرد ہوتے دکھائی دیتے ہیں کہ جن کے سامنے کبھی ہم اپنی ہمت کے بند باندھا کرتے تھے۔ آج وہی موجیں ہماری غیرت و حمیت کو نگلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

اچانک مجھے ماضی کے دھندلکوں میں سے اپنی درخشندہ تاریخ کے چند بوسیدہ مگر سنہری اوراق دکھائی دیے کہ ایک وقت تھا کہ جب مسلمان ایک عام مسلمان کی حرمت پر کٹ مرجایا کرتے تھے۔ کیوں نہ کٹتے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت اللہ سے کہا تھا کہ ٹھیک ہے تو اللہ کا گھر ہے' بڑی عظمت اور شان والا ہے' مگر ایک مسلمان کی عزت اور ناموس تجھ سے بھی بڑھ کر ہے۔ پھر اور بھی اس طرح کے بہت سے واقعات میرے ذہن اور دماغ پر تازیانے برسانے لگے کہ ایک عام مسلمان کی اس قدر عزت اور مرتبت تھی تو پھر اولیاء اللہ' محدثین' تابعین رحمۃ اللہ علیہم

اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عزت و عظمت کا کیا معاملہ ہوگا ـــــ اور اُس مقدس ہستی کی حرمت کے تو کیا کہنے ہوں گے جس کے بارے میں خود مالک ارض و سماء کا ارشاد ہے: ﴿وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ﴾ (الم نشرح) ''اور ہم نے آپ ﷺ کا ذکر بلند کیا''۔ جوں جوں میں سوچتا جا رہا تھا میری آنکھوں سے سیلِ رواں جاری ہو رہا تھا۔ دل بے قابو ہو رہا تھا کہ اے اللہ! ہم اوجِ ثریا سے زمین پر کیوں پٹخ دیے گئے؟ پھر مجھے قرآن مجید کی یہ آیت یاد آئی:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٤١﴾﴾ (الرّوم)

''خشکی اور تری میں لوگوں کی بداعمالیوں کے باعث فساد پھیل گیا' تاکہ اللہ انہیں اُن کے بعض کرتوتوں کا پھل چکھادے' شاید کہ وہ باز آجائیں۔''

یہ ہمارے ہاتھوں کی بوئی ہوئی فصل ہے جسے آج ہم کاٹ رہے ہیں۔ ہم نے تنزلی اور انحطاط کی منزلیں یونہی طے نہیں کرلیں بلکہ بتدریج ذلت کی اس گہری کھائی میں آ گرے۔ ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے مسلمان بھائیوں کو کفار کے حوالے کیا' ان کی حرمت اور تقدس کے سودے کیے' غیروں کی خوشنودی کی خاطر اپنے محسنوں کو پابندِ سلاسل کر دیا۔ یہاں تک کہ ہمارے حکمران اسلامی شعائر کا مذاق اڑاتے رہے اور ہم ٹھنڈے پیٹوں ہضم کرتے رہے۔ اب وقت یہ آن پہنچا ہے کہ مغرب بڑے منظّم انداز سے ہمارے ردّعمل کا جائزہ لینے کے بعد' جذبات کی بلندی ناپنے کے بعد' ڈالروں کی چمک دکھانے کے بعد' مُنہ میں ''تعاون'' کی چوسنیاں دینے کے بعد' روشن خیالی اور اعتدال پسندی کی شاہراہ پر چڑھانے کے بعد' ذلت و رسوائی کی تمام حدود کو پھلانگتے ہوئے ہم سے ہماری آخری متاع بھی چھین رہا ہے اور ظالموں کے ہاتھ دامنِ رحمت عالم ﷺ تک جا پہنچے ہیں۔ ان کے قلم عفونت اور زبانیں زہر اگل رہی ہیں۔ ایک طرف معذرت کا ڈھونگ رچایا جا رہا ہے تو دوسری طرف ان شاتمین کو آزادیٔ صحافت کا ایوارڈ دیا جا رہا ہے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میرے ذہن میں عرصہ سے بند روشن خیالی کا ایک دریچہ کھل اٹھا۔ وہ مجھے تھپکیاں دینے لگا کہ ''دیکھو آخر تم نے بھی تو حرمتِ رسول ﷺ کے تحفظ کے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟ بڑے بڑے جلسے کیے' قراردادیں پیش کیں' کٹ مرنے کی قسمیں کھائیں' جلوس نکالے' ٹائر جلائے' پتلے نذرِ آتش کیے' زبردست نعرے بازی کی' شاتمین کے سروں کی قیمتیں مقرر کیں۔ کیا یہ کافی نہیں؟ اس سے زیادہ تم کر بھی کیا سکتے ہو؟ بھلا تم ان سے کیسے ٹکرا سکتے ہو؟ وہ تو سپر پاور ہے' چاہے تو تمہیں ایک بٹن دبا

کر نیست و نابود کر سکتا ہے۔ لیزر ٹیکنالوجی اس کے پاس ہے‘ جدید ترین سیٹلائیٹ سسٹم کا حامل ہے‘ فضاؤں پر اس کا قبضہ ہے‘ دنیا کے بیشتر ممالک اس کے اتحادی عساکر میں شامل ہیں‘ جاسوسی کا بہترین نظام رکھتا ہے۔ آخر تمہاری اس کے سامنے حیثیت ہی کیا ہے؟ بھلا پانی میں رہ کر مگر مچھ سے دشمنی رکھنا کون سی دانش مندی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔‘‘ اس طرح کے بہت سے جملے میرے پردۂ سماعت سے ٹکرائے‘ لیکن اس کے باوجود میرے دماغ میں ضمیر نام کی ایک خلش سی باقی تھی جس نے فوراً اس روشن خیالی کو ایک پتھر دے مارا اور پوچھا کہ ’’بتاؤ کیا تم اپنی تاریخ فراموش کر چکے ہو؟ دنیا کی سپر پاور کے سامنے آسمان کی اس سپریم پاور کو بھول چکے ہو؟ ایک وقت وہ بھی تھا کہ جب تمہاری تعداد انگلیوں پر گنی جاتی تھی مگر تمہارے خوف سے قیصر و کسریٰ کے ایوان لرزہ براندام ہوتے تھے۔ اُس وقت تمہارے پاس کون سا ایٹم بم تھا‘ سیٹلائیٹ یا ریڈار سسٹم تھا؟ ہاں اُس وقت تمہارے پاس ایک قوت تھی‘ اتحاد کی قوت۔ تم تسبیح کے موتیوں کی طرح ایک لڑی میں تھے۔ تمہارے دل ایمان و یقین کی دولت سے مالا مال اور عزم و ہمت کے خزانے سے لبریز تھے۔ تمہاری روح جذبۂ شہادت سے سرشار تھی۔ آج تم مرنے سے گھبراتے ہو تو موت تمہارا پیچھا کرتی ہے۔ جبکہ اس وقت تم نہیں‘ بلکہ موت اپنا مُنہ چھپایا کرتی تھی۔ پھر تم بڑی بڑی قوتوں کو پاؤں تلے مسل دیتے تھے۔ آج سب کچھ موجود ہے لیکن بتاؤ کہ تمہارے کس عمل سے بش کی صحت پر اثر پڑا؟ تمہارے کس نعرے نے ایوانِ کفر میں لرزہ طاری کیا ہے؟ تمہارے کس پتلے یا ٹائر کو جلانے کی ہلکی آنچ یا تپش بھی ان تک پہنچی ہے؟ یا پھر کشمیر‘ عراق‘ افغانستان اور دنیا کے دوسرے خطوں میں ظلم کی چکی میں پسنے والے مسلمانوں کو راحت پہنچی ہو‘ ابوغریب اور کیوبا کے اسیروں کو سکون ملا ہو‘ یا پھر کم از کم ہمارے اربابِ اختیار کے مُردہ ضمیر پر دستک ہوئی ہو؟ البتہ تمہارے اس کردار سے اپنے دین‘ ایمان‘ ملک اور معیشت کو جو نقصان پہنچا ہے‘ اس سے غیروں کو خوشی ضرور حاصل ہوئی ہوگی‘‘۔ الغرض اس ضمیر نامی خلش نے میرے دماغ پر ایسی پیہم ضربیں لگائیں کہ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے ابھی باہر نکل پڑے گا۔ کرب ہے کہ ناقابل بیان! پیشانی پر عرقِ ندامت پھوٹ پڑا۔ پھر اس نے مجھے جھنجوڑا کہ اب کس بات کا انتظار ہے؟ اٹھو سروں پر کفن باندھ لو! اُمت کی ماں عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنے سرتاج کی ناموس پر اور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی جگر گوشہ سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا اپنے بابا کی حرمت پر کٹ کرنے کو دستک دے رہی ہیں۔ کون ہے جو اِن کی پکار پر لبیک کہتا ہوا ملتِ کفر کا ہاتھ کاٹ دے‘ ان کی پلید زبان کھینچ لے‘ اور سرخرو ہو جائے؟

اگر ایمان میں اتنی پختگی نہیں ہے تو کم از کم اُن کے تہذیب وتمدن، صورت وسیرت، فکر وعمل اوران کی مصنوعات کو خیر باد کہنا تو تمہارے بس میں ہے۔ اِس وقت دنیا میں مسلمانوں کی تعداد سوا ارب سے بھی متجاوز ہے اور وہ سب کے سب امریکہ و یورپ کے بالواسطہ یا بلاواسطہ گاہک ہیں۔ ان میں سے ۴۰ فیصد لوگ ان کی ۸۰ فیصد، ۳۰ فیصد لوگ ان کی ۵۰ فیصد اور باقی ۳۰ فیصد لوگ ان کی ۱۰ فیصد اشیاء کے استعمال کنندہ ہیں۔ اور ہمارے پاس اِس وقت تیل کے دنیا میں سب سے بڑے ذخائر موجود ہیں۔ تیل کو اِس وقت انسانی جسم میں خون کی سی حیثیت حاصل ہے۔ اگر اسلامی ممالک ایک طرف ان کا تیل بند کر دیں اور دوسری طرف ان کی مصنوعات کا بائیکاٹ کر دیں تو یورپ اپنی موت آپ مر جائے گا۔ لیکن اس مہم کا آغاز تمہارے اپنے گھر سے ہوسکتا ہے۔ اور یاد رکھو! اگر اب بھی تم نے ہوش کے ناخن نہ لیے، خوابِ خرگوش سے بیدار نہ ہوئے اور کوئی قدم نہ اٹھایا تو پھر وہ وقت دور نہیں جب فیصلۂ خداوندی آن پہنچے گا اور قیامت کے دن کس مُنہ سے شافع محشر ﷺ کا سامنا کرو گے؟؟ آج بھی وقت ہے، فیصلہ کر لو کہ اب کے بعد ہمیں اپنے رسول ﷺ سے بڑھ کر کوئی چیز قبول نہیں، انہی کی صورت وسیرت ہمارے لیے اُسوۂ حسنہ ہے۔

ہے کوئی شخص جو پہلے سودی کاروبار کرتا ہو اور آج محبتِ رسول ﷺ کا ثبوت دیتے ہوئے سودی نظام کو خیر باد کہہ دے؟ اپنی وضع قطع، اپنا ماحول اور اپنے زندگی کے معاملات کو اسلامی سانچے میں ڈھال لے؟ ہے کوئی سیاست دان جو آج اسمبلی کے فلور پر کھڑا ہو کر اُن کے جھوٹے اور منافقانہ نظام سے اعلانِ بغاوت کر کے اپنی سیاست کو اسلام کے تابع کر لے اور جہاد اور مجاہدین کی حمایت کا اعلان کر دے؟ اگر تم کچھ بھی نہ کر سکے تو پھر اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے خدانخواستہ تمہارا اشمار جانوروں میں ہوگا۔ یہ میرا نہیں قرآن کا فیصلہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝﴾ (الاعراف)

''اور ہم نے بہت سے جن وانس دوزخ کے لیے پیدا کیے ہیں، جن کے دل تو ہیں مگر اُن سے سمجھتے نہیں، جن کی آنکھیں تو ہیں مگر اُن سے دیکھتے نہیں اور جن کے کان تو ہیں مگر اُن سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بدتر۔ یہی تو غافل لوگ ہیں۔'' ○○

مسلمان کا طرزِ حیات (۵۱)

علامہ ابوبکر جابر الجزائری کی شہرۂ آفاق کتاب

"مِنھاجُ المُسلم" کا اردو ترجمہ

مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

کتاب العبادات

گیارھواں باب

① روزے کی تعریف اور تاریخِ فرضیت

۱) روزے کی تعریف

عربی زبان میں صَوْم کا لغوی معنی رکنا اور پرہیز کرنا ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں صَوْم (یعنی روزے) کا مطلب ہے: ''عبادت کی نیت سے صبح صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک کھانے، پینے، ازدواجی عمل اور دیگر اُن افعال سے پرہیز کرنا جو روزے کے منافی ہیں''۔

۲) فرضیت کی تاریخ

اللہ تعالیٰ نے سابقہ اُمتوں پر بھی روزہ فرض کیا تھا۔ اسی طرح حضرت محمد ﷺ کی اُمت پر بھی فرض کیا اور یہ آیت نازل فرمادی:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝١٨٣﴾ (البقرة)

''اے ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، تاکہ تم (گناہ سے اور اللہ کے عذاب سے) بچو۔''

یہ آیت ۲ھ میں شعبان کے مہینے میں نازل ہوئی اور اس دن سوموار تھا۔

② روزے کی فضیلت اور فوائد

ا) فضیلت

مندرجہ ذیل احادیث مبارکہ سے روزے کی فضیلت واضح ہوتی ہے:

۱) ارشادِ نبویؐ ہے:

((اَلصِّيَامُ جُنَّـةٌ مِنَ النَّارِ كَجُنَّةِ اَحَدِكُمْ مِنَ الْقِتَالِ))[۱]

''روزہ جہنم سے (بچانے والی) ڈھال ہے' جس طرح جنگ (میں دشمن کے وار) سے بچانے والی ڈھال ہوتی ہے۔''

۲) ارشادنبویؐ ہے:

((مَنْ صَامَ يَوْمًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ زَحْزَحَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ عَنِ النَّارِ بِذٰلِكَ الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ خَرِيْفًا))[۲]

''جو شخص اللہ کی راہ میں ایک دن روزہ رکھتا ہے' اللہ تعالیٰ اس دن کے بدلے اس کے چہرے سے آگ کو ستر سال کے لیے دور ہٹا دیتا ہے۔''

۳) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ لِلصَّائِمِ عِنْدَ فِطْرِهٖ لَدَعْوَةً لَا تُرَدُّ))[۳]

''روزے دار کی ایک دعا افطار کے وقت ردّ نہیں ہوتی۔''

۴) فرمانِ نبویؐ ہے:

---

۱) مسند احمد۔ امام سیوطی نے اس حدیث پر کوئی تنقید نہیں فرمائی۔ وصحیح البخاری' کتاب الصوم' باب فضل الصوم۔ وصحیح مسلم ' کتاب الصیام' باب فضل الصیام۔ (ان دونوں کی روایت میں صرف یہ لفظ ہیں ''روزہ ڈھال ہے''۔)

۲) سنن النسائی' کتاب الصیام' باب ثواب من صام یوما فی سبیل الله عزوجل ......الخ۔ وصحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب فضل الصوم فی سبیل الله۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل الصیام فی سبیل الله لمن یطیقه بلاضرر ولا تفویت حق۔ (یہ الفاظ سنن نسائی کے ہیں۔)

۳) سنن ابن ماجه' کتاب الصیام' باب فی الصائم لا ترد دعوته۔ ومستدرك حاکم' کتاب الصوم' باب الدعوة عند الافطار۔ امام حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

((اِنَّ فِی الْجَنَّةِ بَابًا یُقَالُ لَهُ الرَّیَّانُ یَدْخُلُ مِنْهُ الصَّائِمُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ لَا یَدْخُلُ مِنْهُ اَحَدٌ غَیْرُهُمْ یُقَالُ : اَیْنَ الصَّائِمُوْنَ؟ فَیَقُوْمُوْنَ لَا یَدْخُلُ مِنْهُ اَحَدٌ غَیْرُهُمْ ' فَاِذَا دَخَلُوْا اُغْلِقَ ' فَلَمْ یَدْخُلْ مِنْهُ اَحَدٌ)) (٤)

''جنت کا ایک دروازہ ہے' جسے ریّان کہتے ہیں' قیامت کے دن اس میں سے روزے دار داخل ہوں گے' ان کے علاوہ اس سے کوئی اور داخل نہیں ہوگا۔ کہا جائے گا: روزے دار کہاں ہیں؟ وہ کھڑے ہوں گے' ان کے سوا اس دروازے سے کوئی اور داخل نہیں ہوگا۔ جب وہ داخل ہوچکیں گے تو دروازہ بند کر دیا جائے گا' پھر اس میں سے کوئی داخل نہیں ہوگا''۔

ب) فوائد:

روزے کے بہت سے روحانی' معاشرتی اور طبی فوائد ہیں' جن میں بطور مثال کچھ فوائد ذکر کیے جاتے ہیں۔

روزے کے روحانی فوائد میں سے بعض یہ ہیں کہ اس سے صبر و برداشت کی عادت بنتی اور اس کی طاقت پیدا ہوتی ہے۔ دل میں تقویٰ پیدا ہوتا اور افزائش پاتا ہے۔ اسی لیے تقویٰ کو روزہ کا واضح مقصد قرار دیا گیا ہے۔ جیسے کہ آیتِ مبارکہ میں بیان ہوا کہ: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴿١٨٣﴾﴾ (البقرة) ''تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا' تاکہ تم متقی بن جاؤ''۔

روزے کے اہم معاشرتی فوائد یہ ہیں کہ اس سے اُمت مسلمہ میں نظم و ضبط' اتحاد اور انصاف و مساوات سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔ مؤمنوں میں رحم کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور احسان کی اچھی عادت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ روزہ کی وجہ سے معاشرہ بہت سی دوسری خرابیوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

صحت کے نقطۂ نظر سے روزہ کے فوائد یہ ہیں کہ اس سے آنتوں کی صفائی اور معدہ کی اصلاح ہوتی ہے۔ بدن مختلف بے کار مادوں سے پاک ہو جاتا ہے' موٹاپا کم ہوتا ہے اور چربی کی وجہ سے پیٹ بڑھ جانے کا علاج ہوتا ہے۔ حدیث میں آنحضرت ﷺ سے یہ قول

---

٤) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب الریان للصائمین۔وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل الصیام۔

روایت کیا گیا ہے: ((صُوْمُوْا تَصِحُّوْا)) (۵) ''روزے رکھو' صحت مند رہو گے''۔

۳ مستحب' مکروہ اور حرام روزے

ا) مندرجہ ذیل ایام میں روزہ رکھنا مستحب ہے

۱) عرفہ کا روزہ: نو ذوالحجہ کا روزہ رکھنا مستحب ہے' لیکن جو شخص حج کے ارکان ادا کر رہا ہو وہ عرفات میں روزہ نہ رکھے۔ ایک حدیث مبارکہ ہے:

سُئِلَ عَنْ صَوْمِ یَوْمِ عَرَفَةَ فَقَالَ : ((یُکَفِّرُ السَّنَةَ الْمَاضِیَةَ وَالْبَاقِیَةَ))

وَسُئِلَ عَنْ صَوْمِ یَوْمِ عَاشُوْرَاءَ فَقَالَ : ((یُکَفِّرُ السَّنَةَ الْمَاضِیَةَ)) (۶)

''(نبی اکرم ﷺ سے) عرفہ کے دن کے روزہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: ''(عرفہ کے روزہ سے) ایک گزشتہ سال کے اور ایک آنے والے سال کے (یعنی دو سال کے) گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور عاشوراء (دس محرم) کے دن کے روزہ کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: ''اس سے گزشتہ سال کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔''

۲) عاشوراء اور تاسوعاء: یعنی دس محرم اور نو محرم کے روزے۔ کیونکہ ارشادِ نبویؐ ہے:

((یُکَفِّرُ السَّنَةَ الْمَاضِیَةَ)) (حوالہ گزر چکا ھے)

''اس (یومِ عاشوراء کے روزہ) سے گزشتہ سال کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔''

اس کے علاوہ جناب رسول اللہ ﷺ نے یومِ عاشوراء کا روزہ رکھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی اس دن روزہ رکھنے کا حکم دیا اور فرمایا:

((فَاِذَا کَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ صُمْنَا الْیَوْمَ التَّاسِعَ)) (۷)

''جب اگلا سال آئے گا تو ان شاء اللہ ہم نو تاریخ کا روزہ بھی رکھیں گے''۔

۳) شوال کے چھ روزے: ارشادِ نبویؐ ہے:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ اَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ کَانَ کَصِیَامِ الدَّهْرِ)) (۸)

---

۵) ابن سنی وابونعیم۔ امام سیوطی نے اسے حسن کہا ہے۔

۶) صحیح مسلم' کتاب الصیام' باب استحباب صیام ثلاثة ایام من کل شھر وصوم یوم عرفة وعاشوراء...... الخ۔

۷) صحیح مسلم' کتاب الصیام' باب ایّ یوم یصام فی عاشوراء۔

۸) صحیح مسلم' کتاب الصیام' باب استحباب صوم ستة ایام من شوال اتباعا لرمضان۔

''جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کے بعد شوال میں چھ روزے رکھے (اس کا یہ عمل) ہمیشہ کے روزوں کی طرح ہو جائے گا۔''

۴) **ماہِ شعبان کا ابتدائی نصف حصہ**: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

((وَمَا رَاَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ اِسْتَکْمَلَ صِیَامَ شَھْرٍ قَطُّ اِلَّا رَمَضَانَ وَمَا رَاَیْتُہٗ فِیْ شَھْرٍ اَکْثَرَ مِنْہُ صِیَامًا فِیْ شَعْبَانَ)) (۹)

''میں نے نہیں دیکھا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے رمضان کے علاوہ کسی اور مہینے میں پورا مہینہ روزے رکھے ہوں' اور میں نے نہیں دیکھا کہ آپ ؐ کسی مہینے میں شعبان سے زیادہ روزے رکھتے ہوں۔''

۵) **ماہِ ذوالحجہ کا پہلا عشرہ**: جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا الْعَمَلُ فِیْ اَیَّامٍ اَفْضَلَ مِنْھَا فِیْ ھٰذِہٖ)) قَالُوْا وَلَا الْجِھَادُ؟ قَالَ ((وَلَا الْجِھَادُ اِلَّا رَجُلٌ خَرَجَ یُخَاطِرُ بِنَفْسِہٖ وَمَالِہٖ فَلَمْ یَرْجِعْ بِشَیْءٍ)) (۱۰)

''کسی اور دنوں میں کیا گیا نیک عمل ان دنوں (یعنی ذوالحجہ کے پہلے دس دنوں) سے زیادہ افضل نہیں''۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کی: ''یارسول اللہ! جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں؟'' فرمایا: ''جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں۔ ہاں وہ شخص (زیادہ محبوب ہو سکتا ہے) جو اپنی جان اور اپنا مال لے کر (جہاد میں) نکلا' پھر کچھ بھی لے کر نہ لوٹا (سب کچھ قربان کر دیا)۔''

۶) **ماہِ محرم**: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَفْضَلُ الصِّیَامِ بَعْدَ رَمَضَانَ شَھْرُ اللّٰہِ الْمُحَرَّمُ)) (۱۱)

''رمضان کے بعد افضل روزے اللہ کے مہینے محرم الحرام کے ہیں''۔

۷) **ایّامِ بیض**: یعنی ہر قمری مہینے کی تیرہ' چودہ اور پندرہ تاریخ کا روزہ۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَنْ نَصُوْمَ مِنَ الشَّھْرِ ثَلَاثَۃَ اَیَّامٍ الْبِیْضَ : ثَلَاثَ

---

۹) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب صوم شعبان۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب صیام النبی ﷺ فی غیر رمضان واستحباب ان لا یخلی۔

۱۰) صحیح البخاری' کتاب الجمعۃ' باب فضل العمل فی ایام التشریق (نحوہ)۔

۱۱) صحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل صوم المحرم (نحوہ)۔

عَشْرَةَ وَاَرْبَعَ عَشْرَةَ وَخَمْسَ عَشْرَةَ)) وَفِیْ رِوَایَةٍ : ((هُوَ کَصَوْمِ الدَّهْرِ)) (۱۲)

''ہمیں جناب رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ مہینے کے تین دن ایام البیض کے روزے رکھیں، یعنی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ کو''۔ ایک اور روایت میں ارشادِ نبویؐ ہے: ''یہ ہمیشہ کے روزوں کی طرح ہیں۔''

۹،۸) سوموار اور جمعرات: حدیث میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام سب سے زیادہ سوموار اور جمعرات کا روزہ رکھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ الْاَعْمَالَ تُعْرَضُ کُلَّ اثْنَیْنِ وَخَمِیْسٍ ـــــ اَوْ کُلَّ یَوْمِ اثْنَیْنِ وَخَمِیْسٍ ـــــ فَیَغْفِرُ اللّٰہُ لِکُلِّ مُسْلِمٍ ـــــ اَوْ لِکُلِّ مُؤْمِنٍ ـــــ اِلَّا الْمُتَهَاجِرِیْنِ فَیَقُوْلُ : اَخِّرْھُمَا))(۱۳)

''یقیناً ہر سوموار اور جمعرات کو ـــــ یا فرمایا: ہر سوموار اور جمعرات کے دن ـــــ اعمال (بارگاہِ الٰہی میں) پیش کیے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہر مسلمان ـــــ یا فرمایا: ہر مؤمن ـــــ کو بخش دیتا ہے، سوائے ان دو افراد کے جو آپس میں قطع تعلق کیے ہوئے ہوں''۔ کہا جاتا ہے: ''انہیں مؤخر کردو''۔

۱۰) داؤدی روزہ: جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اَحَبَّ الصِّیَامِ اِلَی اللّٰہِ صِیَامُ دَاوٗدَ، وَاَحَبَّ الصَّلَاۃِ اِلَی اللّٰہِ صَلَاۃُ دَاوٗدَ عَلَیْہِ السَّلَامُ، کَانَ یَنَامُ نِصْفَ اللَّیْلِ وَیَقُوْمُ ثُلُثَہٗ وَیَنَامُ سُدُسَہٗ وَکَانَ یَصُوْمُ یَوْمًا وَیُفْطِرُ یَوْمًا))(۱۴)

''یقیناً اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب روزہ داؤد علیہ السلام والا روزہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کو

---

۱۲) سنن النسائی ، کتاب الصیام، باب ذکر الاختلاف علی موسی بن طلحة فی الخبر فی صیام۔ وسنن ابن ماجه، کتاب الصیام، باب ما جاء فی صیام ثلاثة ایام من کل شهر۔ ابن حبان نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

۱۳) مسند احمد، ج۲، ص ۲۲۹۔

۱۴) صحیح البخاری۔ وصحیح مسلم ، کتاب الصیام، باب النهی عن صوم الدهر لمن تضرر به او فوت به حقا...... الخ۔

سب سے زیادہ محبوب نماز داوٗد علیہ السلام والی نماز ہے۔ آپؑ آدھی رات سوتے تھے‘ پھر تہائی رات قیام کرتے اور رات کا چھٹا حصہ سورہتے۔ اور ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن نہیں رکھتے تھے۔‘‘

۱۱) کنوارا آدمی جو شادی نہ کرسکے‘ اس کے لیے بھی روزہ رکھنا مستحب ہے: ارشادِ نبویؐ ہے:

((مَنِ اسْتَطَاعَ الْبَاءَ ةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَاَحْصَنُ لِلْفَرْجِ‘ وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ)) (۱۵)

’’تم میں سے جو شخص شادی کرسکتا ہے وہ شادی کرے‘ کیونکہ اس سے نظر نیچی اور عصمت محفوظ رہتی ہے۔ اور جسے طاقت نہ ہو وہ روزے رکھے‘ یہ اُس کے لیے جنسی قوت کے خاتمہ کی طرح ہے۔‘‘

ب) مکروہ روزے

۱) عرفات میں ٹھہرے ہوئے شخص کے لیے یومِ عرفہ کا روزہ: کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اُن حاجیوں کو عرفہ کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے جو میدانِ عرفات میں موجود ہوں۔ (۱۶)

۲) اکیلا جمعہ کے دن کا روزہ: ارشادِ نبویؐ ہے:

((اِنَّ يَوْمَ الْجُمُعَةِ عِيْدُكُمْ فَلَا تَصُوْمُوْهُ اِلَّا اَنْ تَصُوْمُوْا قَبْلَهُ اَوْ بَعْدَهُ)) (۱۷)

’’جمعہ کا دن تمہاری عید ہے تو اس دن روزہ نہ رکھو‘ اِلّا یہ کہ اس سے پہلے یا بعد میں روزہ رکھو۔‘‘

۳) اکیلا ہفتہ کے دن کا روزہ: ارشادِ نبویؐ ہے:

((لَا تَصُوْمُوْا يَوْمَ السَّبْتِ اِلَّا فِيْمَا افْتُرِضَ عَلَيْكُمْ ‘ وَاِنْ لَمْ يَجِدْ اَحَدُكُمْ اِلَّا لِحَاءَ عِنَبَةٍ اَوْ عُوْدَ شَجَرَةٍ فَلْيَمْضَغْهُ)) (۱۸)

---

۱۵) صحیح البخاری‘ کتاب الصوم‘ باب الصوم لمن خاف علی نفسه العزبة۔

۱۶) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الصوم‘ باب فی صوم یوم عرفة بعرفة۔ اسے حاکم نے صحیح کہا ہے۔

۱۷) مسند بزار۔ اس کی سند جید ہے۔ اور یہ مسئلہ صحیحین میں موجود ہے۔ دیکھئے صحیح البخاری‘ کتاب الصوم‘ باب صوم یوم الجمعة۔

۱۸) جامع الترمذی‘ کتاب الصوم‘ باب ما جاء فی صوم یوم السبت۔ امام ترمذی نے اسے حسن کہا ہے۔ وسنن ابوداوٗد‘ کتاب الصوم‘ باب النهی عن ان یخص یوم السبت بالعموم۔ وسنن النسائی۔ وسنن ابن ماجه‘ کتاب الصیام‘ باب ما جاء فی صیام یوم السبت۔

''ہفتہ کے دن روزہ نہ رکھو' مگر جو تم پر فرض کیے گئے ہیں اُن میں ہو (تو رکھ لو)۔اور اگر تم میں سے کسی کو انگور کا چھلکا یا درخت کی لکڑی ہی ملے تو وہی چبا لے۔''

۴) **شعبان کے آخری ایّام کا روزہ**: ارشادِ نبویؐ ہے:

((اِذَا انْتَصَفَ شَعْبَانُ فَلَا تَصُوْمُوْا)) (۱۹)

''جب شعبان آدھا ہو جائے تو روزہ نہ رکھو۔''

نوٹ: مذکورہ بالا ایام میں روزے رکھنا مکروہ تنزیہی ہے' اور مندرجہ ذیل روزے مکروہ تحریمی ہیں:

۱) **وصال**: یعنی دو دن یا زیادہ مدت کے روزے اس طرح رکھنا کہ درمیان میں افطار نہ کیا جائے۔ جناب رسول اللہﷺ نے فرمایا: **((اِیَّاکُمْ وَالْوِصَالَ))** (۲۰) ''وصال نہ کرو''۔ اور فرمایا: **((لَا تُوَاصِلُوْا))** (۲۱) ''وصال سے پرہیز کرو''۔

۲) **شک کے دن کا روزہ**: یعنی شعبان کی تیس تاریخ کا روزہ۔ نبیﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَامَ یَوْمَ الشَّکِّ فَقَدْ عَصٰی اَبَا الْقَاسِمِﷺ)) (۲۲)

''جس نے شک کے دن کا روزہ رکھا اس نے ابوالقاسمﷺ کی نافرمانی کی۔''

۳) **ہمیشہ کا روزہ**: یعنی پورے سال روزے رکھے جائیں اور اس دوران روزے ترک نہ کیے جائیں۔ نبی اکرمﷺ نے تین بار ارشاد فرمایا:

((لَا صَامَ مَنْ صَامَ الْاَبَدَ)) (۲۳)

''جس نے ہمیشہ روزہ رکھا اس نے روزہ ہی نہیں رکھا''۔

اور فرمایا:

---

۱۹) جامع الترمذی' کتاب الصوم' باب ما جاء فی کراھیة الصوم فی النصف الثانی من شعبان۔ و سنن ابوداوٗد' کتاب الصوم' باب فی کراھیة ذلك (یہ لفظ ابوداوٗد کے ہیں)۔

۲۰) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب التنکیل لمن اکثر الوصال۔

۲۱) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب الوصال ومن قال لیس فی اللیل صیام ۔ و سنن الترمذی' کتاب الصوم عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فی کراھیة الوصال للصائم۔

۲۲) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب قول النبی ﷺ اذا رأیتم الھلال فصوموا واذا رأیتموه فافطروا۔

۲۳) صحیح مسلم' کتاب الصیام' باب النھی عن صوم الدھر لمن تضرر به۔

((مَنْ صَامَ الْاَبَدَ فَلَا صَامَ وَلَا اَفْطَرَ)) (٢٤)

''جس نے ہمیشہ روزہ رکھا اس نے نہ روزہ رکھا نہ افطار کیا''۔

۴) **عورت کا خاوند کی موجودگی میں بلا اجازت روزہ**: ارشادِ نبویؐ ہے:

((لَا تَصُمِ الْمَرْاَةُ یَوْمًا وَاحِدًا وَزَوْجُھَا شَاھِدٌ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ـــــ قَالَ وَکِیْعٌ : اِلَّا رَمَضَانَ)) (٢٥)

''عورت ایک دن بھی روزہ نہ رکھے جب کہ اس کا خاوند حاضر ہو مگر اس کی اجازت سے' سوائے رمضان کے۔''

ج) حرام روزے

مندرجہ ذیل ایام میں روزے رکھنا حرام ہے:

۱) **عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن**: حضرت عمرؓ نے فرمایا:

((اِنَّ ھٰذَیْنِ یَوْمَانِ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ عَنْ صِیَامِھِمَا: یَوْمُ فِطْرِکُمْ مِنْ صِیَامِکُمْ وَالْآخَرُ یَوْمٌ تَاْکُلُوْنَ فِیْہِ مِنْ نُسُکِکُمْ)) (٢٦)

''یہ دو دن ایسے ہیں جن میں روزہ رکھنے سے جناب رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ ایک تمہارے (فرض) روزوں سے فراغت کا دن اور ایک جس دن تم اپنی قربانیوں کا گوشت کھاتے ہو۔''

۲) **ایام تشریق**: یعنی عید قربان کے بعد والے تین دن۔ حدیث میں ہے کہ:

((اَرْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ صَائِحًا یَصِیْحُ فِیْ (مِنًی) اَنْ لَا تَصُوْمُوْا ھٰذِہِ الْاَیَّامِ ' فَاِنَّھَا اَیَّامُ اَکْلٍ وَشُرْبٍ وَبعالٍ (٢٧) وَفِیْ لَفْظٍ : وَذِکْرِ اللّٰہِ))

---

٢٤) سنن النسائی' کتاب الصیام' باب ذکر الاختلاف علی عطاء فی الخبر فیه۔ وسنن ابن ماجه' کتاب الصیام' باب ما جاء فی صیام الدھر۔

٢٥) مسند احمد۔ وصحیح البخاری (اس میں یہ الفاظ نہیں ''سوائے رمضان کے'') وصحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب ما انفق العبد من مال مولاہ (اس میں بھی رمضان کا ذکر نہیں)۔

٢٦) صحیح مسلم' کتاب الصیام' باب النھی عن صوم یوم الفطر ویوم الاضحی۔

٢٧) طبرانی۔ یہ مسئلہ دوسرے الفاظ میں صحیح مسلم میں بھی مذکور ہے۔ کتاب الصیام' باب تحریم صوم ایام التشریق۔

''رسول اللہ ﷺ نے ایک اعلان کرنے والا بھیجا کہ وہ منیٰ میں بلند آواز سے اعلان کرے کہ ان دنوں میں روزہ نہ رکھو' کیونکہ یہ تو کھانے پینے اور بیویوں سے دل بہلانے کے دن ہیں''۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''اور اللہ کی یاد کے دن ہیں''۔

۳) **ایام حیض ونفاس**: علمائے اُمت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ حیض یا نفاس شروع ہونے سے روزہ ختم ہو جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا:

((اَلَیْسَ اِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ؟)) قُلْنَ بَلٰی؟ قَالَ: ((فَذٰلِکِ مِنْ نُقْصَانِ دِیْنِھَا)) (۲۸)

''کیا ایسا نہیں کہ جب عورت حیض سے ہوتی ہے تو نہ نماز پڑھتی ہے نہ روزہ رکھتی ہے؟'' خواتین نے عرض کی کیوں نہیں! (یقیناً ایسا ہی ہے) آپؐ نے فرمایا: ''یہ اس کے دین کا نقص ہے''۔

۴) **مریض**: اگر مریض کو روزہ رکھنے کی صورت میں ہلاکت کا اندیشہ ہو تو اسے بھی روزہ رکھنا حرام ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَکُمْ ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُمْ رَحِیْمًا۝۲۹﴾ (النساء)

''اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرنے والا ہے۔''

④ رمضان کے روزوں کی فرضیت اور فضیلت

ا) رمضان کے روزوں کی فرضیت

ماہِ رمضان کے روزوں کی فرضیت قرآن مجید' سنت نبویؐ اور اجماعِ اُمت سے ثابت ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ ج فَمَنْ شَھِدَ مِنْکُمُ الشَّھْرَ فَلْیَصُمْہُ ط﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن مجید انسانوں کے لیے رہنما بنا کر اور ہدایت و فرقان (حق و باطل میں امتیاز) کے واضح دلائل (کا حامل) بنا کر نازل کیا گیا' تو تم لوگوں میں سے جو کوئی اس مہینہ میں موجود ہو وہ اس کے روزے رکھے۔''

ارشادِ نبویؐ ہے:

---

۲۸) صحیح البخاری' کتاب الحیض' باب ترک الحائض الصوم۔

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ : شَهَادَةِ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلَاةِ وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ))[۲۹]

''اسلام کو پانچ چیزوں پر تعمیر کیا گیا ہے: لا الٰہ اِلاّ اللہ محمدٌ رسول اللہ کی گواہی' نماز قائم کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا' (بیت اللہ کا) حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا''۔

نیز فرمایا:

((عُرَی الْاِسْلَامِ وَقَوَاعِدُ الدِّیْنِ ثَلَاثَةٌ عَلَیْهِنَّ اُسِّسَ الْاِسْلَامُ مَنْ تَرَکَ وَاحِدَةً مِنْهُنَّ فَهُوَ بِهَا کَافِرٌ حَلَالُ الدَّمِ : شَهَادَةُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَالصَّلَاةُ الْمَکْتُوْبَةُ وَصَوْمُ رَمَضَانَ))[۳۰]

''اسلام کے حلقے اور دین کی بنیادیں تین ہیں' انہی پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ جس نے ان میں سے ایک کو بھی چھوڑ دیا اس نے ان کا انکار کیا' اس کا خون کرنا جائز ہے۔ (وہ تین امور یہ ہیں) لا الٰہ الاّ اللہ کی گواہی' فرض نماز اور رمضان کے روزے۔''

ب) رمضان کے فضائل

ماہِ رمضان بہت سی خوبیوں اور فضیلتوں کا حامل ہے جو دوسرے مہینوں کو حاصل نہیں۔ تفصیل کے لیے مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیں:

ا) ارشادِ نبویؐ ہے:

((اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ اِلَی الْجُمُعَةِ وَرَمَضَانُ اِلٰی رَمَضَانَ مُکَفِّرَاتٌ لِمَا بَیْنَهُنَّ اِذَا اجْتُنِبَتِ الْکَبَائِرُ))[۳۱]

''پانچ نمازیں' ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک کے لیے اور ایک رمضان دوسرے رمضان تک کے لیے درمیانی مدت کے گناہوں کا کفارہ ہیں' بشرطیکہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے۔''

---

۲۹) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب بنی الاسلام علی خمس۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان ارکان الاسلام ودعائمہ العظام۔

۳۰) مسند ابویعلیٰ' ح ۲۳۴۹ عن ابن عباس رضی اللہ عنهما۔ اس کی سند حسن ہے۔

۳۱) صحیح مسلم' کتاب الطهارة' باب الصلوات الخمس والجمعة الی الجمعة ورمضان الی رمضان...... الخ

۲) ارشادِ نبویؐ ہے:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَ لَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ)) (۳۲)

''جس نے ایمان رکھتے ہوئے ثواب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے اس کے پچھلے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔''

۳) آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((وَرَاَیْتُ رَجُلًا مِنْ اُمَّتِیْ یَلْھَثُ عَطَشًا کُلَّمَا وَرَدَ حَوْضًا مُنِعَ مِنْہُ ' فَجَاءَ ہٗ صِیَامُ رَمَضَانَ فَسَقَاہُ وَرَوَّاہُ)) (۳۳)

''میں نے دیکھا کہ میری اُمت کا ایک شخص پیاس کی شدت سے ہانپ رہا ہے' جب بھی حوض پر آتا ہے اسے (پانی پینے سے) روک دیا جاتا ہے۔ رمضان کے روزے آئے اور اسے پانی پلا کر سیراب کر دیا۔''

۴) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا کَانَ اَوَّلُ لَیْلَۃٍ مِنْ شَھْرِ رَمَضَانَ صُفِّدَتِ الشَّیَاطِیْنُ وَمَرَدَۃُ الْجِنِّ وَغُلِّقَتْ اَبْوَابُ النَّارِ فَلَمْ یُفْتَحْ مِنْھَا بَابٌ وَفُتِّحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّۃِ فَلَمْ یُغْلَقْ مِنْھَا بَابٌ' وَیُنَادِیْ مُنَادٍ : یَا بَاغِیَ الْخَیْرِ اَقْبِلْ ' وَیَا بَاغِیَ الشَّرِّ اَقْصِرْ وَلِلّٰہِ عُتَقَاءُ مِنَ النَّارِ وَذٰلِکَ کُلَّ لَیْلَۃٍ)) (۳۴)

''جب رمضان کی پہلی رات آتی ہے تو شیطان اور سرکش جن جکڑ دیے جاتے ہیں' جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں' ایک بھی دروازہ کھلا نہیں رہتا' اور جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں' ایک بھی دروازہ بند نہیں رہتا' اور ایک منادی آواز دیتا ہے: اے نیکیوں کے طالب! آگے بڑھ' اور اے برائیوں کے متلاشی! کم کر' اور اللہ تعالیٰ (بہت سے) بندوں کو جہنم سے آزاد کر دیتا ہے۔ اور (پورے مہینے میں)

---

۳۲) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب من صام رمضان ایمانا واحتسابا ...... الخ۔ وصحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب الترغیب فی قیام رمضان وھو التراویح۔

۳۳) یہ آنحضرت ﷺ کے ایک طویل خواب کا ایک حصہ ہے۔ دیکھئے طبرانی۔

۳٤) جامع الترمذی' کتاب الصوم' باب ما جاء فی فضل شھر رمضان۔ ومستدرك حاکم' کتاب الصوم' باب اذا کان اول لیلۃ من رمضان صفدت الشیاطین۔ انہوں نے اسے صحیحین کی شرط پر صحیح قرار دیا ہے۔

ہر رات اسی طرح ہوتا ہے۔''

⑤ رمضان میں نیکیاں کرنے کی فضیلت

رمضان کی فضیلت کی وجہ سے اس مہینے میں ادا کیا جانے والا ہر نیک کام اور ہر احسان دوسرے دنوں سے زیادہ فضیلت والا شمار ہوتا ہے۔ یہاں چند نیکیوں کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے۔

۱) صدقہ : جناب رسول اللہ ﷺ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے افضل صدقہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپ ؐ نے فرمایا:

((صَدَقَةٌ فِیْ رَمَضَانَ)) (۳۵)

''(سب سے افضل صدقہ) رمضان میں دیا گیا صدقہ ہے۔''

نیز فرمایا:

((مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا کَانَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِهٖ مِنْ غَيْرَ اَنَّهٗ لَا يَنْقُصُ مِنْ اَجْرِ الصَّائِمِ شَيْئًا)) (۳۶)

''جو شخص کسی روزہ دار کو روزہ افطار کراتا ہے اسے روزہ دار کے برابر ہی ثواب ملے گا' جبکہ روزہ دار کے ثواب میں کچھ بھی کمی نہیں ہو گی۔''

ارشاد نبویؐ ہے:

((مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا عَلٰی طَعَامٍ اَوْ شَرَابٍ مِنْ حَلَالٍ صَلَّتْ عَلَيْهِ الْمَلَائِکَةُ فِیْ سَاعَاتِ شَهْرِ رَمَضَانَ وَصَلّٰی عَلَيْهِ جِبْرِيْلُ لَيْلَةَ الْقَدْرِ)) (۳۷)

''جس نے کسی روزہ دار کو حلال (روزی سے حاصل کیے ہوئے) کھانے یا پانی سے روزہ افطار کرایا' فرشتے ماہِ رمضان کی گھڑیوں میں اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں اور جبریل علیہ السلام شب قدر کو اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔''

آنحضرت ﷺ سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی سخاوت کا

---

۳۵) جامع الترمذی' کتاب الزکاۃ' باب ما جاء فی فضل الصدقۃ۔ اس کی سند ضعیف ہے۔

۳۶) جامع الترمذی' کتاب الصوم' باب ما جاء فی فضل من فطر صائما۔ حدیث صحیح ہے۔ و مسند احمد۔ و سنن ابن ماجه' کتاب الصیام' باب فی ثواب من فطر صائما۔

۳۷) طبرانی' معجم کبیر' ج٦' ص ۲٦۲' حدیث ٦١٦٢ عن سلمان رضی اللہ عنه۔

سب سے زیادہ اظہار ماہِ رمضان میں ہوتا تھا جب جبریل علیہ السلام حضور علیہ الصلاۃ والسلام سے ملاقات کرتے تھے۔ (۳۸)

۲) قیام اللیل: جناب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیمَانًا وَّاحتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ)) (۳۹)

''جو شخص ایمان رکھتے ہوئے ثواب کی نیت سے رمضان شریف میں قیام کرے گا اس کے گزشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی رمضان کی راتوں میں عبادت کرتے تھے۔ خصوصاً آخری دس راتوں میں گھر والوں کو بھی جگاتے تھے' اور ہر چھوٹا بڑا جو نماز پڑھ سکتا ہوا سے جگاتے تھے۔ (۴۰)

۳) قرآن کریم کی تلاوت: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں قرآن کریم کی تلاوت کثرت سے کرتے تھے اور حضرت جبریل علیہ السلام حضور علیہ السلام کے ساتھ قرآن کریم کا دَور کرتے تھے۔ (۴۱)

رمضان المبارک کی راتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام دوسرے دنوں سے زیادہ طویل ہوتا تھا۔ ایک رات حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز میں شریک تھے۔ حضور علیہ السلام نے سورۃ البقرۃ' سورۂ آل عمران اور سورۃ النساء کی تلاوت فرمائی۔ جب بھی کوئی ایسی آیت آتی جس میں اللہ کے عذاب کا اور اللہ سے ڈرنے کا ذکر ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت روک کر دعا فرماتے۔ ابھی دو رکعتیں ہی پڑھی تھیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ فجر کی نماز کے لیے جگانے کی غرض سے حاضر ہو گئے۔ (۴۲)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:

((اَلصِّیَامُ وَالْقُرْآنُ یَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ ' یَقُوْلُ الصِّیَامُ اَیْ رَبِّ

۳۸) صحیح البخاری' باب بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ وصحیح مسلم' کتاب الصوم' باب اجود ما یکون النبی صلی اللہ علیہ وسلم یکون فی رمضان۔

۳۹) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب تطوع قیام رمضان من الایمان۔ وصحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین' باب الترغیب فی قیام رمضان وھو التراویح۔

۴۰) صحیح مسلم' کتاب الاعتکاف' باب الاجتھاد فی العشر الاواخر من رمضان۔

۴۱) صحیح البخاری' باب بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

۴۲) صحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین' باب استحباب تطویل القراءۃ فی صلاۃ اللیل (اس میں یہ ذکر نہیں کہ دو رکعتوں میں رات گزر گئی)

مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْهِ' وَیَقُوْلُ الْقُرآنُ مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّیْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْهِ' قَالَ: فَیُشَفَّعَانِ))[۴۳]

''روزہ اور قرآن قیامت کے دن بندے کی شفاعت کریں گے۔ روزہ عرض کرے گا: اے ربّ! میں نے اسے دن کے وقت کھانے اور جنسی خواہش سے روک دیا تھا' پس اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما! قرآن کہے گا: اے ربّ! میں نے اسے رات کو سونے سے روک دیا تھا' (اب) اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرما۔ نبی اکرمﷺ فرماتے ہیں پس دونوں کی شفاعت قبول کی جائے گی''۔

۴) اعتکاف :اعتکاف کا مطلب ہے کہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کی نیت سے مسجد میں عبادت کے لیے رکے رہنا۔ جناب رسول اللہﷺ وفات تک رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرتے رہے۔[۴۴] حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا:

((اَلْمَسْجِدُ بَیْتُ کُلِّ تَقِیٍّ وَتَکَفَّلَ اللّٰہُ لِمَنْ کَانَ الْمَسْجِدُ بَیْتَهٗ بِالرَّوْحِ وَالرَّحْمَةِ وَالْجَوَازِ عَلَی الصِّرَاطِ اِلٰی رِضْوَانِ اللّٰہِ اِلَی الْجَنَّةِ))[۴۵]

''مسجد ہر متقی کا گھر ہے اور مسجد جس کا گھر بن جائے اللہ اس کے لیے راحت' رحمت اور پل صراط سے گزر کر جنت میں اللہ کی خوشنودی تک پہنچ جانے کی ضمانت دیتا ہے۔''

۵) عمرہ: یعنی رمضان میں کعبہ شریف کا طواف اور سعی کرنے کے لیے کعبہ شریف کی زیارت کرنا۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((فَاِنَّ عُمْرَةً فِیْ رَمَضَانَ تَقْضِیْ حَجَّةً ـــ أَوْ حَجَّةً مَعِیَ))[۴۶]

''رمضان میں عمرہ کرنا میرے ساتھ حج کرنے کے برابر ہے۔''

((اَلْعُمْرَةُ اِلَی الْعُمْرَةِ کَفَّارَةٌ لِمَا بَیْنَهُمَا))[۴۷]

''ایک عمرہ کی وجہ سے سابقہ عمرہ تک درمیانی مدت کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں'۔

۴۳) مسند احمد' ج۲' ص ۱۷۴ (نحوہ)۔

۴۴) صحیح البخاری' کتاب الاعتکاف' باب الاعتکاف فی العشر الاواخر۔

۴۵) طبرانی۔

۴۶) صحیح البخاری' کتاب الحج' باب حج النساء ۔ وصحیح مسلم' کتاب الحج' باب فضل العمرۃ فی رمضان (اس میں ''میرے ساتھ'' کا لفظ نہیں ہے)۔

۴۷) صحیح البخاری' کتاب الحج' باب وجوب العمرۃ وفضلها ۔وصحیح مسلم' کتاب الحج' باب فی فضل الحج والعمرۃ ویوم عرفة۔

امام محمد بن ادریس شافعیؒ

۱۵۰ھ ——— ۲۰۴ھ

عبدالرشید عراقی

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظامؒ اور تبع تابعینؒ کے خیر القرون کے دوران دینِ اسلام کی نشر واشاعت میں ائمہ اربعہ کی خدمات تاریخِ اسلام کے اوراق میں ایک زریں باب ہے۔ ائمہ اربعہ اپنے علم وفضل، زہد وورع، تقویٰ وطہارت اور تبحر علمی میں ایک ممتاز مقام کے حامل تھے۔ امام محمد بن ادریس شافعیؒ انہی میں سے ایک ہیں۔

نام ونسب

امام شافعیؒ کا نام محمد بن ادریس، کنیت ابوعبداللہ اور ناصر الحدیث لقب تھا۔ شافعی آپؒ کے جدّ اعلیٰ شافع کی طرف نسبت ہے۔

شجرۂ نسب اس طرح ہے: محمد بن ادریس بن عثمان بن شافع بن سائب بن عبید بن عبد یزید بن ہاشم بن عبدالمطلب بن عبد مناف القرشی المطلبی۔ (۱)

ساتویں پشت پر آپؒ کا سلسلۂ نسب آنحضرت ﷺ سے مل جاتا ہے۔

ولادت

امام شافعی رجب ۱۵۰ھ میں بمقام غزہ جو بیت المقدس کے قریب ایک چھوٹا سا قریہ ہے، پیدا ہوئے۔ اور اسی دن امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ کا بغداد میں انتقال ہوا۔ مؤرخ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ جس دن امام شافعیؒ پیدا ہوئے اسی دن امام ابوحنیفہؒ کا انتقال ہوا۔ (۲)

محی السنۃ مولانا سید نواب صدیق حسن خان لکھتے ہیں:

درایں جا میان حنفیه و شافعیه مزاح است حنفیه گویند امام شافعی نهفته بود تا آں که امام ما انتقال کرد، شافعیه گویند چوں امام ما ظاهر

شد امام شما بگیریخت۔

''اس واقعہ نے احناف وشوافع کے درمیان ایک مذاق پیدا کر دیا ہے۔حنفیہ کہتے ہیں کہ جب تک ہمارے امام کا انتقال نہ ہوگیا تمہارے امام چھپے رہے' اور شوافع کہتے ہیں کہ جیسے ہی ہمارے امام ظاہر ہوئے تمہارے امام چلتے بنے۔''

علامہ یافعی نے بھی اپنی کتاب مراءۃ الجنان میں اس مزاح کا ذکر کیا ہے۔ (۳)

ابتدائی حالات

جب امام شافعی کی عمر دو سال ہوئی تو ان کی والدہ جن کا تعلق قبیلہ ازد سے تھا' آپ کو لے کر حجازِ مقدس آ گئیں' اور وہاں سے اپنے قبیلہ میں یمن منتقل ہو گئیں۔ یمن میں امام شافعی نے اپنی زندگی کے دس سال گزارے۔ جب ان کی والدہ کو ان کی نسبی شرافت کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہوا تو دوبارہ مکہ معظّمہ واپس آ گئیں۔ (۴) اور مکہ معظّمہ میں امام شافعی کی نشو ونما ہوئی۔

آغازِ تعلیم

امام شافعی کی پیدائش غریب گھرانے میں ہوئی تھی۔ والد کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی ذکاوت وفطانت سے نوازا تھا۔صغر سنی ہی میں آپ کی صلاحیتیں منظرِ عام پر آنے لگی تھیں۔تعلیم کا آغاز حفظ قرآن مجید سے کیا اور سات سال کی عمر میں حافظ قرآن ہو گئے۔ حفظ قرآن کے بعد حفظ حدیث کی طرف متوجہ ہوئے' اور موطأ امام مالک کو نو (۹) شب میں حفظ کر لیا۔ابن فرحون لکھتے ہیں:

کان الشافعی حافظاً' حفظ الموطا فی تسع لیال (۵)

''امام شافعی حافظ تھے' انہوں نے موطا کو نو راتوں میں حفظ کر لیا تھا۔''

حفظ حدیث کے بعد فقہ کی جانب متوجہ ہوئے اور پندرہ سال کی عمر میں فقہ میں اتنی استعداد پیدا کر لی کہ ان کے اُستاد امام مسلم بن خالد زنجی نے ان کو فتویٰ دینے کی اجازت دے دی۔ مکہ میں امام مسلم بن خالد کے علاوہ امام سفیان بن عیینہ سے بھی استفادہ کیا تھا۔ امام سفیان بن عیینہ بھی ان کے علم وفضل اور ذہانت وفطانت کے معترف تھے۔ (۶) امام شافعی نے مکہ معظّمہ میں تین سال تعلیم حاصل کی۔

امام مالکؒ کے حلقۂ درس میں

مکہ معظّمہ میں امام شافعی تین سال تک امام مسلم بن خالد زنجی اور حضرت امام سفیان بن

عیینہ سے استفادہ کے بعد امام دارالہجرۃ مالک بن انس کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ اُس وقت آپ کی عمر تیرہ سال تھی۔

امام مالک سے جب آپ کی ملاقات ہوئی اور اُس وقت آپ کی جو مکالمت ہوئی اس کی تفصیل امام شافعی اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

''جب میں امام مالک کی خدمت میں پہنچا تو میں موطا حفظ کر چکا تھا۔ میں نے عرض کیا کہ میں آپ سے موطا پڑھنا چاہتا ہوں۔ امام مالک نے فرمایا: اچھا کسی کو بلا لاؤ جو تمہارے لیے قراءت کرے۔ میں نے جواب دیا کہ اس کی ضرورت نہیں' میں خود ہی پڑھوں گا۔ اور جب میں نے اس کی قراءت کی تو امام مالک نے بڑے تعجب کا اظہار کیا اور قراءت کو پسند فرمایا۔ اور آخر میں نے بہت تھوڑی مدت میں موطا ختم کر لی۔''

امام شافعی امام مالک کی خدمت میں صرف آٹھ ماہ رہے۔ اور اس مختصر مدت میں اُستاد اور شاگرد میں گہرے روابط قائم ہو گئے۔ (۷)

امام مالک امام شافعی کی ذہانت و فطانت کی بہت تعریف فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن امام مالک نے فرمایا:

> ''تمہارے قلب میں ایک نور ہے' معاصی سے اسے ضائع نہ کرنا۔ تم تقویٰ کو شعار بنانا' ایک دن آئے گا تم بڑے شخص بنو گے۔''(۸)

امام شافعی بھی اپنے اُستاد کا بہت احترام کرتے تھے اور فرماتے تھے:

مالک معلمی و استاذی و منه تعلمنا العلم وما احد امنّ علیّ من مالک وجعلتُ مالکاً حجة فیما بینی و بین اللّٰه (۹)

> ''مالک میرے معلم اور اُستاد ہیں۔ میں نے علم ان ہی سے سیکھا' ان سے زیادہ مجھ پر کسی کا احسان نہیں ہے۔ میں نے ان کو اپنے اور اللہ کے درمیان حجت بنایا ہے۔''

امام شافعی امام مالک کی خدمت میں آٹھ ماہ رہ کر واپس مکہ معظّمہ آ گئے اور محدث شہیر امام سفیان بن عیینہ کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کرتے رہے۔

امام شافعی پر دورِ ابتلاء

مدینہ منورہ سے واپس آ کر امام شافعی مکہ میں قیام فرما ہوئے تو طلب علم کے ساتھ ساتھ ان کو فکرِ معاش دامن گیر ہوئی۔ حسنِ اتفاق سے والیٔ یمن مکہ معظّمہ آیا ہوا تھا۔ بعض عمائدینِ قریش نے سفارش کی کہ شافعی میں ایسی اہلیت موجود ہے کہ انہیں کوئی سرکاری خدمت سپرد کی

جائے۔ چنانچہ والیٔ یمن نے آپ کو نجران کا گورنر مقرر کر دیا۔ والیٔ یمن بڑا سفاک اور ظالم تھا۔ رعایا پر بہت زیادہ ظلم وستم کرتا تھا۔ امام شافعی اس کو ظلم وستم کرنے سے روکتے تھے۔ والیٔ یمن اب اس کوشش میں رہنے لگا کہ کسی طرح امام شافعی سے خلاصی ہو جائے۔ چنانچہ اُس نے خلیفہ ہارون الرشید کو خط لکھا کہ شافعی علوی سادات کے ساتھ ہیں جس سے ایک بہت بڑا فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

خلیفہ ہارون الرشید یہ خط پڑھ کر آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے والیٔ یمن کو خط لکھوایا کہ شافعی اوران کے تمام ساتھیوں کو فوراً دارالخلافہ بھیج دو۔ چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی اور امام شافعی کو گرفتار کرکے دربارِ خلافت میں بھیج دیا گیا۔ امام شافعی کو جب خلیفہ ہارون الرشید کے سامنے پیش کیا گیا تو اتفاق سے امام محمد بن حسن شیبانی بھی وہاں موجود تھے۔ اُن کی سفارش سے امام شافعی کو معافی مل گئی۔ (۱۰)

امام محمدؒ کے حلقۂ درس میں شرکت

خلیفہ ہارون الرشید کی تلوار سے نجات پا کر امام شافعی امام محمد کے زیر سایہ آ گئے۔ امام محمد فقہ عراق کے امام تھے۔ امام شافعی یہاں آنے سے پہلے امام محمد کے علمی تبحر اور مرتبۂ اجتہاد وتفقہ سے پوری طرح واقف ہو چکے تھے۔ چنانچہ امام شافعی نے امام محمد سے تعلیم حاصل کرنا شروع کی اور اُن کی خدمت میں تین سال رہ کر فقہ عراق میں کمال پیدا کیا' اور بالآخر فقہ کے بانی ومؤسس قرار پائے۔ (۱۱)

امام شافعی نے امام محمد سے جو کسب فیض کیا تھا' اس پر تا عمر اُن کے ممنونِ کرم رہے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''میں نے امام محمد بن حسن سے جو کچھ پڑھا' سنا اور نقل کیا' وہ بارِ شتر کے برابر ہے۔''

امام محمد بھی امام شافعی کی ذہانت و فطانت کے معترف تھے۔ (۱۲) اور دوسرے تلامذہ کے مقابلہ میں امام شافعی کی بہت زیادہ توقیر کرتے تھے۔ (۱۳)

اساتذہ وشیوخ

امام شافعی کے اساتذہ کی تعداد کا اندازہ لگانا بہت دشوار ہے۔ حافظ ابن حجر نے آپؒ کے اساتذہ کی تعداد اسّی (۸۰) بتائی ہے۔ (۱۴) خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں آپ کے چھبیس (۲۶) اساتذہ کے نام لکھے ہیں۔ (۱۵) تاہم آپ کے مشہور اساتذہ

کے نام یہ ہیں:

مسلم بن خالد، سفیان بن عیینہ، امام مالک بن انس، مطرف صنعانی، عمرو بن سلمہ، امام محمد بن حسن، فضیل بن عیاض، اسمعیل بن علیہ، وکیع بن الجراح اور عبدالوہاب بن عبدالمجید المصری۔ (۱۶)

درس وتدریس

امام شافعی بغداد سے مکہ معظّمہ واپس آئے اور مسجد الحرام میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور نو (۹) سال تک آپ نے درس وتدریس کی بساط بچھائے رکھی۔ امام احمد بن حنبلؒ بھی ان سے یہیں ملے اور ایسے گرویدہ ہوئے کہ آپ کے حلقۂ تلمّذ میں داخل ہو گئے۔ مکہ معظّمہ کے اس نو سالہ قیام میں امام صاحب نے فقہِ جدید کی بنیاد ڈالی، اور اجتہاد واستنباط کے اصول وضوابط مرتب فرمائے۔

بغداد کے اسفار

امام صاحبؒ نے بغداد کا پہلا سفر ۱۸۴ھ میں کیا، جب آپ کو خلیفہ ہارون الرشید نے طلب کیا تھا۔ (۱۷) دوسری بار ۱۹۵ھ میں بغداد کا سفر کیا۔ اُس وقت آپ طالب علم کی حیثیت سے نہیں گئے تھے، بلکہ اُس وقت آپ کا آفتابِ شہرت آسمان پر ضوفگن ہو چکا تھا۔ جب آپ بغداد پہنچے تو علماء فقہ وحدیث آپ کے گرد جمع ہو گئے اور آپ کے فیضانِ صحبت سے مستفیض ہوئے۔ اسی دَور میں آپ نے اپنی مشہور کتاب ''الرسالہ'' تصنیف کی۔ اس سفر میں دو سال آپ کا بغداد میں قیام رہا۔ ۱۹۷ھ میں مکہ معظّمہ واپس آ گئے۔ تیسری بار آپؒ ۱۹۸ھ میں بغداد تشریف لے گئے اور صرف ایک ماہ قیام کے بعد واپس مکہ معظّمہ آ گئے۔

مصر میں مستقل قیام

۱۹۸ھ میں امام موسیٰ کاظم کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے بعد آپ مصر تشریف لے گئے۔ امام صاحب نے مصر میں مستقل رہائش کو کیوں ترجیح دی؟ اس بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

> ''ایک تو والیٔ مصر عباس بن عبداللہ ان کا بہت زیادہ عقیدت مند تھا اور اس نے آپ کو مصر میں مستقل رہائش کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور دوسری طرف امام صاحب کے سفر مصر کا اصلی مقصد اپنے مذہب کی اشاعت وترویج تھی۔ حجاز وعراق میں ان کو

اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہو چکی تھی۔ اس لیے امام صاحب نے مصر میں اپنے مذہب کی اشاعت کا پروگرام بنایا۔ امام صاحب کے شاگرد ربیع المرادی نے آپ سے کہا کہ مصر میں دو مذہب کے لوگ پائے جاتے ہیں' یعنی حنفی اور حاکمی' اور یہ لوگ اپنے اپنے امام کے اقوال کے پیرو ہیں۔''

امام شافعی نے فرمایا:

''میں ان شاء اللہ مصر جاؤں گا اور ان کے سامنے ایسی چیز پیش کروں گا کہ وہ دونوں مذاہب کو چھوڑ دیں گے۔''

ربیع المرادی کہتے ہیں کہ:

''خدا کی قسم جب امام شافعی مصر آئے تو انہوں نے اپنی یہ بات سچ کر دکھائی۔''(۱۸)

تلامذہ

امام صاحب کے تلامذہ کی فہرست بھی طویل ہے۔ مشہور تلامذہ یہ ہیں:

احمد بن حنبل' اسحاق بن راہویہ' ابوعلی الزعفرانی' ابوالولید موسیٰ بن جارود' امام مترنی' ربیع المرادی' سلیمان بن داؤد اور یونس بن عبدالاعلیٰ وغیرہ۔(۱۹)

قولِ قدیم اور قولِ جدید

قولِ قدیم سے مراد امام صاحب کے وہ اقوال ہیں جو انہوں نے قیامِ مصر سے پہلے مکہ' مدینہ' یمن اور بغداد میں قائم کیے تھے۔ ان کی تصنیف ''کتاب الـ''قدیم اقوال پر مشتمل ہے۔(۲۰) جب امام صاحب مصر آ گئے تو آپ نے اپنے سابقہ خیالات و نظریات پر از سرِ نو تفحص کیا اور قدیم اقوال سے رجوع کر کے نئی آراء قائم کیں۔ ان نئے آراء و خیالات کو قولِ جدید سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قولِ جدید کے سلسلہ میں آپ نے ''کتاب الاُمّ'' اور ''الرسالہ'' تصنیف کیں۔(۲۱)

امام صاحب نے اپنی بغدادی تصانیف جو قدیم اقوال پر مشتمل ہیں' کی روایت کی اجازت نہیں دی۔ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ:

''امام شافعی نے اپنے قولِ قدیم سے رجوع کر لیا تھا اور جب کوئی مجتہد اپنے کسی قول سے رجوع کر لے تو پھر وہ اُس کی طرف منسوب نہیں کیا جائے گا۔''(۲۲)

تبحرِ علمی

امام شافعی پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت تھی کہ تمام علوم اسلامیہ میں ان کو ید طولیٰ حاصل

تھا‘ اور علم وفن کے ہر شعبہ میں ان کو مہارت تامّہ حاصل تھی۔ کتاب اللہ‘ سنتِ رسول اللہ ﷺ‘ آثارِ صحابہ وتابعین‘ علم کلام‘ اسماء الرجال‘ ادب ولغت‘ سیر وتاریخ‘ عربیت اور شعر وسخن میں اللہ تعالیٰ نے انہیں عمیق ارزانی عطا فرمائی تھی۔ (۲۳)

آپ حافظ حدیث تھے‘ آپ کے مذہب کی بنیاد صحیح حدیث پر قائم ہے۔ خود فرماتے ہیں:

اذا صح الحدیث فھو مذھبی (۲۴)

’’صحیح حدیث ہی میرا مذہب ہے۔‘‘

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ امام شافعی فرمایا کرتے تھے:

’’اگر میرا کوئی قول سنتِ رسول اللہ ﷺ کے خلاف ہو تو اُس کو ترک کر دو۔‘‘

امام شافعی کے ایک شاگرد زعفرانی فرماتے ہیں کہ:

کان اصحاب الحدیث رقودًا حتّٰی جاء الشافعی فایقظھم فتیقظوا (۲۵)

’’تمام محدثین خوابِ غفلت میں مبتلا تھے‘ امام شافعی نے آ کر اُن میں بیداری پیدا کی۔‘‘

حدیث

علمِ حدیث اور اس کے متعلقات پر امام صاحب کو عبورِ کامل تھا۔ حدیث میں ان کی ژرف نگاہی کا اعتراف ان کے اساتذہ نے بھی کیا ہے۔ امام ابوحاتم رازی کا قول ہے:

لولا الشافعی لکان اصحاب الحدیث فی عمی (۲۶)

’’اگر امام شافعی نہ ہوتے تو اصحابِ حدیث تاریکی میں رہتے۔‘‘

حافظ ذہبی نے ایک صاحبِ علم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

ما اعلم الشافعی حدیثاً خطأ (۲۷)

مجھے امام شافعی کی کسی غلط حدیث کا علم نہیں۔‘‘

امام محمد بن حسن کا قول حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب ’’توالی التاسیس‘‘ میں نقل کیا ہے کہ:

ان تکلم اصحاب الحدیث یوماً بلسان الشافعی (۲۷)

’’اصحاب حدیث ایک روز امام شافعی کی زبان میں کلام کریں گے۔‘‘

فقہ

فقہ پر بھی امام شافعی کو عبورِ کامل تھا اور اس فن میں ان کو مجتہدانہ مقام حاصل تھا۔ اس فن

میں ان کے عبورِ کامل کی شہادت ان کی تصانیف ''الرسالۃ'' اور ''کتاب الأم'' سے مل سکتی ہے۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ: ''امام شافعی علوم اہل الرائے اور اہل الحدیث کے جامع تھے۔''(۲۹)

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ: ''فقہ فقیہوں کے لیے ایک قفل تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے امام شافعی کے ذریعے کھولا۔''

جامعیت

امام شافعی علوم اسلامیہ کے جامع تھے۔ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ وہ کس فن میں خصوصی ملکہ رکھتے تھے۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں ہارون بن سعید کا یہ قول نقل کیا ہے کہ: ''اگر امام شافعی پتھر کے ستون کو لکڑی کا ثابت کرنا چاہیں تو واللہ انہیں اس پر قدرت حاصل ہے۔''(۳۰)

فصاحت

فصاحت و بلاغت پر امام صاحب کو عبورِ کامل تھا' اور آپ نہایت فصیح اللسان تھے۔

امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے امام عبداللہ بن احمد فرماتے ہیں:

کان الشافعی من افصح الناس

''امام شافعی (اپنے دور میں) سب سے بڑھ کر فصیح اللسان تھے۔''

ابن ہشام نحوی فرماتے ہیں کہ: ''میں ایک عرصہ تک امام شافعی کی صحبت میں رہا' میں نے ان سے کبھی زبان کی غلطی نہیں سنی اور نہ کوئی ایسا کلمہ سنا جس سے بہتر دوسرا کلمہ کہا جا سکتا ہے۔''

لغت پر بھی ان کو عبورِ کامل تھا۔ ابن ہشام نے ''**کان الشافعی فی اللغۃ** کے الفاظ سے اس کا اعتراف کیا ہے۔(۳۱)

امام شافعی اور علم اصولِ فقہ

امام شافعی کا سب سے عظیم کارنامہ اصولِ فقہ کی ایجاد ہے۔ تمام علمائے اسلام اور ارباب سیر کا اس پر اتفاق ہے کہ اصولِ فقہ کے بانی امام محمد بن ادریس شافعی تھے۔

علامہ ابن خلدون اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ: ''امام شافعی کو اصولِ فقہ کے مدوّن کرنے میں اوّلیت حاصل ہے۔ اس فن میں انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''الرسالۃ'' تصنیف کی جس میں انہوں نے اوامر و نواہی کا بیان' اور خبر نسخ اور قیاس سے علت منصوصہ کے حکم کے

بارے میں کلام کیا ہے۔حنفی علماء نے ان کے بعد اس فن میں کتابیں لکھیں۔''(۳۲)

علمائے اسلام کے علاوہ مستشرقینِ مغرب نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ امام شافعی اصولِ فقہ کے بانی تھے' اور آپ کو اصولِ فقہ کا پہلا مصنف قرار دیا ہے۔ مسٹر گولڈ زیر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں لفظ''فقہ'' کے تحت لکھتا ہے:

''محمد بن ادریس شافعی کی خصوصیات میں سے ہے کہ انہوں نے مسائل شرعیہ کو مستنبط کرنے کے ضوابط وضع کیے' اور تمام اصولوں کی حد بندی کی ہے۔ اپنے''رسالہ'' میں قیاسِ عقلی کے ایسے اصول ایجاد کیے جن کی طرف قانون سازی کے وقت رجوع کرنا نہایت ضروری ہے۔''(۳۳)

امام شافعی کی ان گونا گوں خصوصیات کی بنا پر امام احمد بن حنبل نے بجا فرمایا تھا کہ:

''امام شافعی کی حیثیت علم کے لیے ایسی ہی تھی جیسے دنیا کے لیے سورج کی اور جسم کے لیے صحت کی۔ کیا ان دونوں کا کوئی بدل ہو سکتا ہے؟''(۳۴)

تصانیف

امام شافعی نے مختلف علوم پر بکثرت کتابیں لکھیں۔ علمائے اسلام اور اربابِ سیر نے ان کی تعداد کے متعلق مختلف بیانات دیے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ۱۵۰ کتابوں کے نام شمار کرائے ہیں۔(۳۵)

تاہم آپ کی درج ذیل کتابیں زیادہ معروف ہیں:

(۱)کتاب الحجة (۲)کتاب الاُمّ (۳)الرسالة (۴) مسند شافعی

(۱) **کتاب الحجة** کتاب امام صاحب نے بغداد میں تصنیف کی۔ اس کے متعلق صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:

''یہ ایک ضخیم کتاب ہے جو عراق میں لکھی گئی۔ جب مطلق مذہب قدیم بولا جائے تو اس سے یہی کتاب مراد لی جاتی ہے۔''(۳۶)

(۲) **کتاب الاُمّ** کتاب امام شافعی کے مذہبِ جدید کی تصنیف ہے اور ۱۵ مجلدات پر محیط ہے۔

(۳) **الرسالة** یہ کتاب اصولِ فقہ پر ہے۔ صاحب معجم الادباء اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

هو اول الكتاب الّف فى هذا العلم

''اصول فقہ کے موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جو تصنیف ہوئی۔''

(۴) **مسند شافعی** کتاب امام شافعی کی تصنیف کردہ نہیں ہے' بلکہ کتاب الام وغیرہ کتب شافعی سے احادیث کا انتخاب ہے۔

اس اہم کام کو ابوجعفر محمد بن مطر نیشاپوری نے انجام دیا ہے۔

امام شافعی دوسری صدی ہجری کے مجدّد تھے

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((انّ اللّٰہ یبعث لھذہِ الامۃ علی رأس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا))

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے آخر میں اِس اُمت کے لیے ایک شخص کو مبعوث کرتا ہے جو اُس کے دین کی تجدید کرتا ہے۔''

اس حدیث کو امام ابوداؤد نے اپنی سنن اور امام حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔ ملاعلی قاری نے اس کی سند کو صحیح اور اس کے کُل رواۃ کو ثقہ قرار دیا ہے۔ (۳۷)

علمائے اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ پہلی صدی ہجری کے مجدد حضرت عمر بن عبدالعزیز تھے۔ اسی طرح باتفاق علمائے اسلام دوسری صدی ہجری کے مجدد امام شافعی تھے' جنہوں نے بدعات کا قلع قمع کیا' اور سنت کا بول بالا کیا اور تمام روئے زمین کو قال اللہ وقال الرسول کے ترانوں سے معمور کر دیا۔ حافظ ابن حجر نے امام احمد بن حنبل کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''پہلی صدی ہجری کے مجدد حضرت عمر بن عبدالعزیز تھے' اور دوسری صدی ہجری کے امام محمد بن ادریس شافعی تھے اور دونوں خاندانِ رسول (قریش) سے تھے۔'' (۳۸)

تشیع کا الزام

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ امام شافعی پر تشیع کا بھی الزام لگایا گیا ہے' لیکن اس میں صداقت نہیں ہے۔ اس کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ آپ کو آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ محبت تھی۔

حافظ ابن عبدالبر قرطبی نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ امام شافعی سے سوال کیا گیا کہ آپ میں تشیع کا رجحان پایا جاتا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ تمہیں کیونکر معلوم ہوا ہے؟ جواب میں آپ سے کہا گیا کہ آپ آلِ رسول سے محبت کرتے ہیں۔ امام صاحب نے جواب دیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ)) (۳۹)

”تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مؤمنِ کامل نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے والد‘ اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔“

امام شافعی کا ایک شعر ہے:

ان کان رفضاً حب آل محمد
فلیشهد الثقلان انی رافضی

”اگر اہل بیت کی محبت ہی کا نام رفض ہے تو اے جن وانس! تم گواہ رہو کہ میں رافضی ہوں۔“

علمائے اسلام نے لکھا ہے کہ امام شافعی پر تشیع کا الزام محض معاصرانہ رشک وحسد کا نتیجہ ہے۔ (۴۰)

وفات

امام صاحب نے ۵۴ سال کی عمر میں ۲۰۴ھ میں مصر میں انتقال کیا۔ (۴۱)

حواشی

(۱) تاریخ بغداد‘ ج ۲‘ ص ۷۰۔
(۲) تاریخ ابن خلکان‘ ج ۲‘ ص ۲۱۴۔
(۳) مراءۃ الجنان‘ ج ۲‘ ص ۲۵۔
(۴) البدایہ والنہایہ‘ ج ۱۰‘ ص ۲۵۱۔
(۵) الدیباج المذہب‘ ص ۲۲۸۔
(۶) ایضاً۔
(۷) توالی التاسیس‘ ص ۵۱۔
(۸) تاریخ ابن خلکان‘ ج ۲‘ ص ۳۰۶۔
(۹) الدیباج المذہب‘ ص ۲۲۸۔
(۱۰) البدایہ والنہایہ‘ ج ۱۰‘ ص ۲۵۲۔
(۱۱) حیات الشافعی ابوزہرہ‘ ص ۲۲۶۔
(۱۲) البدایہ والنہایہ‘ ج ۱۰‘ ص ۲۵۳۔
(۱۳) تاریخ ابن خلکان‘ ج ۳‘ ص ۳۰۶۔
(۱۴) توالی التاسیس‘ ص ۵۳۔
(۱۵) تاریخ بغداد‘ ج ۲‘ ص ۵۶۔
(۱۶) ایضاً۔
(۱۷) البدایہ والنہایہ‘ ج ۱۰‘ ص ۲۵۲۔
(۱۸) توالی التاسیس‘ ص ۷۷۔
(۱۹) ایضاً۔
(۲۰) کشف الظنون‘ ج ۱‘ ص ۴۲۰۔
(۲۱) توالی التاسیس‘ ص ۷۷۔
(۲۲) شرح مسلم‘ ج ۲‘ ص ۱۸۷۔
(۲۳) تاریخ ابن خلکان‘ ج ۲‘ ص ۲۱۴۔
(۲۴) مختصر صفوۃ الصفوۃ ابن جوزی‘ ص ۲۱۴۔
(۲۵) الدیباج المذہب‘ ص ۲۲۸۔ التاج المکلل‘ ص ۶۰۔

(۲۶) مراءۃ الجنان، ج ۲، ص ۱۹۔

(۲۷) العبر فی خبر من غبر، ج ۴، ص ۳۴۴۔

(۲۸) توالی التاسیس، ص ۵۴۔

(۲۹) ایضاً۔

(۳۰) تاریخ بغداد، ج ۲، ص ۶۷۔

(۳۱) تبع تابعین، ج ۲، ص ۳۶۵۔

(۳۲) مقدمہ ابن خلدون، ص ۴۹۸۔

(۳۳) تبع تابعین، ج ۲، ص ۳۶۷۔

(۳۴) الدیباج المذہب، ص ۲۲۹۔

(۳۵) توالی التاسیس، ص ۱۱۶۔

(۳۶) کشف الظنون، ج ۱، ص ۴۲۰۔

(۳۷) مرقاۃ المفاتیح، ج ۱، ص ۲۴۸۔

(۳۸) توالی التاسیس، ص ۴۸۔

(۳۹) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول من الایمان۔

(۴۰) تبع تابعین، ج ۲، ص ۳۷۴۔

(۴۱) العبر فی خبر من غبر، ج ۱، ص ۳۴۳۔

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (33)

ترکی

(TURKEY)

تحقیق و تحریر: سید قاسم محمود

تُرکی : ایک نظر میں

پورا نام: جمہوریہ ترکی

رقبہ: 780,580 مربع کلومیٹر

آبادی: چھ کروڑ 90 لاکھ

اوسط عمر: 72 سال

سالانہ شرح پیدائش: 1.13 فی صد

آبادی کی گنجانی: 229 فی مربع میل

دارالحکومت: انقرہ (آبادی 36 لاکھ)

زبانیں: ترکی، کُردی، عربی، آرمینی، یونانی

نسلیں: ترک 80 فیصد، کُرد 20 فیصد

مذہب: اسلام 99.8 فیصد، دیگر 0.2 فیصد

شرح خواندگی: 87 فیصد

کل قومی پیداوار: 458 ارب ڈالر سالانہ

فی کس آمدنی: 6700 ڈالر

سالانہ شرح افزائش: 5.8 فی صد

افراطِ زر: 25.3 فی صد

قابلِ کاشت رقبہ: 30.93 فیصد

زراعت: تمباکو، کپاس، اجناس، زیتون، چقندر، دالیں، مالٹا، مویشی۔

صنعت: پارچہ بافی، ڈبہ بند غذا، کاریں، کان کنی، اسٹیل، تیل، کاغذ۔

تیل کے ذخائر: 288 ملین بیرل

گیس کے ذخائر: 6.685 بلین مکعب میٹر

بیرونی قرضہ: 147.3 ارب ڈالر

زرمبادلہ کے ذخائر: 35.55 ارب ڈالر

کرنسی: ترک لیرا

برآمدات: 49.12 ارب ڈالر (ملبوسات، غذائیں، دھات کا سامان، ٹرانسپورٹ کے آلات)

درآمدات: 62.43 ارب ڈالر (مشینری، کیمیکل، ایندھن، ٹرانسپورٹ کے پرزہ جات)

تجارتی ساتھی: جرمنی، اٹلی، برطانیہ، روس، فرانس، سوئٹزرلینڈ، امریکہ

تُرکی

طبقات الارض اور جغرافیائی خدوخال کے اعتبار سے ترکی کو مندرجہ ذیل پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(1) بحیرۂ اسود کا ساحلی علاقہ: مشرق میں کوہ قاف سے لے کر مغرب میں آبنائے باسفورس تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں آبادی کی گنجانی کم ہے۔

(2) بحیرۂ ایجین کا ساحلی علاقہ: اس ساحلی میدان میں پہاڑی ٹیلے اور گھاٹیاں پھیلی ہوئی ہیں جن کے درمیان کہیں کہیں زرخیز وادیاں ہیں، جہاں آبادی کی گنجانی زیادہ ہے۔

(3) بحیرۂ روم کا ساحلی علاقہ: یہ ترکی کے جنوبی حصے میں ہے جس کے شمال میں کوہ طارس کا

سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ طارس پہاڑ سے نکلنے والی تیز رو ندیاں ہر سال اس میدان میں رسوبات تہ نشین کرتی ہیں۔ یہ میدان نہایت زرخیز ہے۔

(4) اناطولیہ کا مرتفع علاقہ (پلیٹو): ساحلی میدانوں اوراونچے پہاڑی سلسلوں سے گھرا ہوا یہ ترکی کا سب سے بڑا قدرتی خطہ ہے جو سطح سمندر سے 600 تا 1200 میٹر اونچا ہے۔ اس پلیٹو پر بہت سے نشیبی دلدل، جھاڑیاں، رسوبی میدان اور قدرتی جھیلیں ہیں۔

(5) مشرق کا پہاڑی علاقہ: چاروں طرف سے آ کر پہاڑی سلسلے اس علاقے میں ملتے ہیں جن کو ''آرمینیا کی گانٹھ'' کہتے ہیں۔ دجلہ اور فرات انہی پہاڑوں سے نکل کر عراق اور شام سے گزرتے ہوئے خلیج فارس میں جا گرتے ہیں۔ ترکی کی مشہور جھیل وان اسی پہاڑی علاقے میں ہے۔

تاریخی پس منظر

ترک ایشیائے کوچک میں پہلے خانہ بدوشوں کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ پھر ایک ایسی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو ڈیڑھ سو برس کے اندر دنیا کی زبردست طاقتوں میں شمار کی جانے لگی۔ تین سو سال بعد یہ سلطنت طاقت کے لحاظ سے دنیا کی سب سے زیادہ عظیم الشان سلطنت بن گئی۔

چھٹی صدی عیسوی میں ترکوں نے ایک وسیع سلطنت قائم کر لی جو منگولیا اور چین کی شمالی سرحد سے لے کر بحر اسود تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس سلطنت کا بانی تومن تھا۔ ساتویں صدی میں اس سلطنت کو چین کی اطاعت قبول کرنا پڑی، لیکن 682ء میں شمالی ترکوں نے چین سے گلوخلاصی کرا لی اور انہیں ایک بار پھر خودمختاری حاصل ہوگئی۔ یہ خودمختاری 744ء تک حاصل رہی، کیونکہ عرب مسلمانوں نے نصر بن سیار کی قیادت میں اس حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ترکوں اور عربوں کے تعلقات پہلی صدی ہجری میں ولید اوّل کے عہدِ خلافت سے شروع ہوئے۔ اسی عہد میں قتیبہ بن مسلم نے بخارا، سمرقند، خوارزم، فرغانہ، تاشقند اور کاشغر کے ترک علاقے فتح کر کے وہاں اسلامی حکومتیں قائم کیں۔

طغرل بیگ

آلِ سلجوق کا مورثِ اعلیٰ کاشغر کے ترک قبائل کا ایک رئیس تھا، جس کا نام وقاق تھا۔ اُس کا لڑکا سلجوق اپنے غیر مسلم ترک فرماں روا کو چھوڑ کر بخارا کی اسلامی مملکت میں چلا آیا اور یہاں وہ اور اُس کا پورا قبیلہ مسلمان ہو کر بخارا کے قریب ایک مقام جند میں سکونت پذیر ہوا۔ اُس نے غیر مسلم ترکوں پر فتوحات حاصل کر کے اپنی قوت بہت بڑھا لی۔ اُس نے اپنی وفات کے بعد تین لڑکے ارسلان، میکائیل اور موسیٰ چھوڑے۔ سلطنت سلجوقیہ کے وارث میکائیل کے تین لڑکے پیغو، طغرل اور جعفرو بیگ قرار پائے، لیکن فرماں روائی طغرل بیگ کو ملی، جس نے اپنی قوت اور زورِ بازو کا لوہا گرد و پیش کے تمام ممالک سے منوایا۔ اُس نے خراسان، جرجان، طبرستان اور خوارزم کو بھی اپنی سلطنت میں شامل

کرلیا۔طغرل ہی نے خلیفہ قائم بامراللہ کے حکم پر بغداد میں آلِ بویہ کا خاتمہ کیا تو بغداد میں بھی آلِ سلجوق کا اثر قائم ہوگیا۔خلیفہ نے اسے سلطانِ شرق وغرب کا خطاب دیا۔اس کے بعد طغرل بیگ نے عراق، موصل اور دیار بکر کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اس کے بعد الپ ارسلان کے عہد میں ایشیائے کوچک اور شام بھی فتح ہوگئے ۔1092ء میں عدن اور یمن بھی ملک شاہ سلجوقی نے فتح کرکے سلطنت سلجوق میں شامل کرلیے۔

ارطغرل بیگ

تیرہویں صدی میں جس زمانے میں ہندوستان میں غیاث الدین بلبن اور علاء الدین خلجی حکومت کر رہے تھے، اُس زمانے میں عثمانی ترکوں کی عظیم الشان سلطنت کی بنیادیں مضبوط ہو رہی تھیں ۔ یہ آلِ عثمان کی سلطنت تھی جسے سلطنتِ عثمانیہ، دولتِ عثمانیہ اور خلافتِ عثمانیہ بھی کہتے ہیں، کیونکہ اس کے بانی کا نام عثمان خان تھا۔عثمانی نسلاً ترک تھے۔ اُن کی حکومت قائم ہونے کا قصہ دلچسپ ہے۔ جب ہلاکو خان کے زمانے میں بغداد پر منگولوں نے قبضہ کرلیا تو چندسال بعد اُن کی ایک فوج ایشیائے کوچک پر قبضہ کرتی ہوئی شہر انقرہ کے قریب پہنچ گئی۔ یہاں قونیہ کے سلجوقی سلطان نے ان کا مقابلہ کیا۔اس وقت جبکہ دونوں میں لڑائی ہو رہی تھی، خانہ بدوش ترکوں کی ایک جماعت یہاں سے گزری، جس کا سردار ارطغرل تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک فوج تعداد میں زیادہ ہے اور ایک کم۔ ارطغرل کے پاس صرف 444 سوار تھے، لیکن وہ کمزور فوج کی مدد کے لیے بڑھا اور اس زور سے حملہ کیا کہ طاقتور فوج کو شکست ہوگئی اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ یہ طاقتور فوج منگولوں کی تھی اور کم تعداد کمزور فوج سلجوقیوں کی تھی۔

عثمان خان (1288ء۔1326ء)

ارطغرل کی اس بہادری اور اخلاقی مدد کے بدلے میں سلطان علاء الدین سلجوقی نے اسے ایک جاگیر دی۔ چندسال بعد 1288ء میں ارطغرل کا انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا عثمان اُس کا جانشین ہوا۔ 1300ء میں قونیہ کی سلجوقی حکومت کو منگولوں نے ختم کردیا اور سلطان علاء الدین جنگ میں مارا گیا۔ اب عثمان خان نے ایک خودمختار حکومت قائم کرلی جو اُس کے نام پر سلطنتِ عثمانیہ کہلائی۔

عثمان خان کی جاگیر کی سرحد قسطنطنیہ کی بازنطینی سلطنت سے ملی ہوئی تھی۔ یہ وہی بازنطینی حکومت تھی جو عربوں کے زمانے میں رومی سلطنت کے نام سے مشہور تھی اور جسے الپ ارسلان اور ملک شاہ سلجوقی کے زمانے میں سلجوقیوں نے اپنا باج گزار بنالیا تھا۔اب یہ بازنطینی سلطنت بہت چھوٹی اور کمزور ہوگئی تھی، لیکن پھر بھی عثمان خان کی جاگیر کے مقابلے میں بہت مستحکم اور طاقتور تھی۔ بازنطینی قلعہ دار عثمان کی جاگیر پر حملے کرتے رہتے تھے، جس کی وجہ سے عثمان خان اور بازنطینی حکومت کے

درمیان لڑائی شروع ہوگئی۔ عثمان خان نے ان لڑائیوں میں بڑی بہادری اور قابلیت کا ثبوت دیا اور بہت سے علاقے فتح کر لیے، جن میں بروصہ کا مشہور شہر بھی شامل تھا۔ بروصہ کی فتح کے بعد عثمان کا انتقال ہوگیا۔

عثمان بڑا بہادر اور دانش مند حکمران تھا۔ رعایا کے ساتھ عدل وانصاف کرتا تھا' اُس کی زندگی پاکیزہ اور سادہ تھی۔ دولت اُس نے کبھی جمع نہیں کی۔ مالِ غنیمت یتیموں اور غریبوں کا حصہ نکالنے کے بعد سپاہیوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ وہ فیاض، رحم دل اور مہمان نواز تھا۔ اُس کی اِن خوبیوں کی وجہ سے ترک آج بھی اس کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ رواج ہوگیا کہ جب کوئی بادشاہ تخت پر بیٹھتا تھا تو عثمان کی تلوار اُس کی کمر سے باندھی جاتی تھی اور یہ دعا کی جاتی تھی کہ خدا اس میں عثمان کے جیسی ہی خوبیاں پیدا کرے۔

کہتے ہیں کہ عثمان نے ایک خواب دیکھا کہ: ''ایک زبردست اور گھنا درخت اُس کے پہلو سے نمودار ہوا جو بڑھتا چلا گیا' یہاں تک کہ اس کی شاخیں بحروبر پر چھا گئیں۔ درخت کی جڑ سے نکل کر دنیا کے چار بڑے دریا بہہ رہے تھے اور چار بڑے بڑے پہاڑ اس کی شاخوں کو سنبھالے ہوئے تھے۔ اس کے بعد نہایت تیز ہوا چلی اور اس درخت کی پتیوں کا رُخ ایک عظیم الشان شہر کی طرف ہوگیا۔ یہ شہر ایک ایسی جگہ واقع تھا جہاں دو سمندر اور دو براعظم ملتے تھے اور ایک انگوٹھی کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ عثمان اس انگوٹھی کو پہننا چاہتا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی''۔

عثمان کے اس خواب کو بہت اچھا سمجھا گیا اور بعد کے لوگوں نے اس کی تعبیر یہ بتائی کہ چار دریا دجلہ، فرات، نیل اور ڈینیوب تھے' اور چار پہاڑ کوہ طور' کوہ بلقان' کوہ قاف اور کوہ اطلس تھے۔ بعد میں عثمان کی اولاد کے زمانے میں چونکہ سلطنت ان دریاؤں اور پہاڑوں تک پھیل گئی تھی' اس لیے یہ خواب دراصل سلطنت عثمانیہ کی وسعت سے متعلق ایک پیشین گوئی تھی۔ شہر سے مطلب قسطنطنیہ کا شہر تھا جسے عثمان فتح نہیں کر سکا اور وہ بعد میں فتح ہوا۔

عثمان کے بعد اُس کی اولاد میں بڑے بڑے بادشاہ ہوئے جنھوں نے اس کے خواب کو سچا کر دکھایا۔ تاریخ اسلام میں کسی خاندان کی حکومت اتنے طویل عرصے تک نہیں رہی جتنے عرصے تک آلِ عثمان کی حکومت رہی' اور نہ کسی خاندان میں آلِ عثمان کے برابر قابل اور اہل حکمران ہوئے۔ ان بادشاہوں کی فہرست بہت لمبی ہے' اس لیے اس مختصر مضمون میں صرف چند بادشاہوں کا ذکر کیا جائے گا۔

آرخان (1326ء۔1359ء)

عثمان کے بعد اس کا لڑکا بادشاہ ہوا۔ اس کا عہد دو باتوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ ایک تو اِس وجہ سے کہ اس کے زمانے میں مسلمانوں نے پہلی مرتبہ مشرقی یورپ میں قدم رکھا۔ بعد میں ترکوں نے یورپ میں جو فتوحات کیں' گویا اُن کا آغاز آرخان ہی کے زمانے میں ہوا۔ دوسری بات ینی چری

یعنی نئی فوج کی تنظیم ہے۔ یہ فوج دنیا کی پہلی باقاعدہ فوج کہی جاتی ہے۔ یہ پیدل فوج تھی اور اس کی فوجی تربیت اتنی اچھی تھی کہ دنیا کی کوئی فوج اس کے مقابلے میں جم کر نہیں لڑ سکتی تھی۔ ترکوں نے جس قدر فتوحات کیں، ان میں سب سے زیادہ ہاتھ اس فوج کا تھا۔ آرخان ہی کے زمانے میں عثمانیوں نے اپنا پہلا سکّہ جاری کیا۔

ایشیا اور یورپ کے درمیان سمندر کی ایک پتلی پٹی ہے جو دردانیال کہلاتا ہے۔ اس سمندر کے دوسری طرف یورپ کا جو حصہ ہے وہ گیلی پولی کہلاتا ہے۔ یہاں سے سمندر کو پار کرنا چونکہ آسان ہے، اس لیے ہر حملہ آور یورپ سے ایشیا اور ایشیا سے یورپ جاتے وقت یہیں سے داخل ہوتا ہے۔ گیلی پولی آرخان ہی کے عہد میں مسلمانوں کے تسلط میں آیا۔ اس کے بعد گیلی پولی سے ملے ہوئے علاقے پر بھی آرخان کا قبضہ ہو گیا۔ جب آرخان کا انتقال ہوا تو سلطنت عثمانیہ کا رقبہ عثمان خان کے زمانے سے تین گنا زیادہ ہو گیا تھا۔

آرخان بھی اپنے باپ کی طرح سادہ زندگی گزارتا تھا۔ اُس نے اپنی سلطنت میں مسجدیں، مدرسے اور رفاہِ عامہ کی عمارتیں بنوائیں۔ دارالحکومت بروصہ میں ایک عالی شان مسجد اور ایک بڑا مدرسہ اور ایک شفاخانہ تعمیر کرایا۔ یہ وہ پہلا عثمانی سلطان ہے جس نے علوم وفنون کی سرپرستی کی۔ بڑے بڑے علماء اس کی صحبت میں رہتے تھے۔ وہ غریبوں کو روٹی اور سالن اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتا تھا۔

سلطان مُراد اوّل (1359ء۔1389ء)

آرخان کے بعد اُس کا لڑکا مُراد اوّل تخت نشین ہوا۔ مُراد بھی قابلیت میں اپنے باپ دادا کی طرح تھا۔ ملک گیری اور فتوحات میں تو وہ ان سے بھی آگے بڑھ گیا۔ یورپ میں بازنطینی علاقے سے ملے ہوئے بلغاریہ، سرویا اور جوسینا کے علاقے تھے، جہاں الگ الگ حکومتیں قائم تھیں۔ مُراد نے کوبا کے مقام پر بلقان کی مسیحی ریاستوں کی متحدہ فوج کو شکست دی۔ اس کے بعد مُراد نے ان تمام حکومتوں کو یا تو فتح کر لیا یا مطیع بنا لیا۔ مُراد نے ایشیا میں بھی کئی علاقے فتح کیے۔ اس کے زمانے میں عثمانی سلطنت کا رقبہ ایک لاکھ مربع میل ہو گیا، یعنی آرخان کے عہد سے پانچ گنا زیادہ۔ ترکوں کا سرخ ہلالی پرچم سلطان مُراد کے زمانے میں شروع ہوا۔

بایزید یلدرم (1389ء۔1402ء)

مُراد اول کے بعد اس کا لڑکا بایزید حکمران ہوا۔ اس نے پہلی مرتبہ سلطان کا لقب اختیار کیا۔ بایزید اپنے باپ کی طرح فوجی صلاحیت رکھتا تھا، لیکن اس میں ایک بری عادت آ گئی تھی اور وہ تھی شراب پینے کی۔ اس کو شراب نوشی کی عادت اس کی ایک عیسائی بیوی نے ڈال دی۔ بایزید پہلا عثمانی حکمران ہے جس نے شراب پی۔

بایزید کو اگرچہ شراب کی عادت لگ گئی تھی لیکن میدانِ جنگ میں وہ شیر کی طرح جاتا تھا اور اپنے تیز حملوں کی وجہ سے یلدرم (یعنی بجلی) کہلاتا تھا۔ 1396ء میں اس نے نکوپولس کے میدانِ جنگ میں یورپ کی متحدہ فوجوں کو شکست دی اور سلطنت کو دُور دُور تک پھیلا دیا۔ اسی طرح اُس نے مشرق میں ایشیائے کوچک کا بڑا حصہ فتح کر لیا اور وہ اب یورپ میں آگے بڑھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ بدقسمتی سے اس کے ملک پر سمرقند کے بادشاہ امیر تیمور نے حملہ کر دیا۔ انگورا کے میدان میں دونوں کا مقابلہ ہوا۔ بایزید کو شکست ہوئی اور وہ قید ہو گیا۔

محمد اوّل (1413ء۔1421ء)

بایزید کی شکست کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب عثمانی سلطنت ختم ہو جائے گی' لیکن اس کے لڑکے محمد اوّل نے چند سال میں کھوئی ہوئی سلطنت پھر سے حاصل کر لی۔ اس لحاظ سے ہم اسے سلطنتِ عثمانیہ کا دوسرا بانی کہہ سکتے ہیں۔ سلطان محمد اوّل بے حد کشادہ دل' منصف مزاج اور وعدے کا پابند حکمران تھا۔ اس نے ادب کی سرپرستی کی۔ اگرچہ اس کا دَورِ حکومت صرف آٹھ سال پر محیط تھا' لیکن عثمانیوں میں شعر و شاعری کا مذاق اوّل اوّل اسی کے دَور میں شروع ہوا۔ اُس کو ترکی کی تاریخ میں محمد چلیبی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چلیبی ترکی زبان میں عالم اور نیک لوگوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ بروصہ کی مسجد کے خطیب' امام سلیمان چلیبی متوفی 1422ء نے اپنی غیر فانی نظم ''مولد'' جو آنحضور ﷺ کی سیرتِ پاک سے متعلق ہے' محمد اوّل کے دور میں لکھی۔ یہ نظم اتنی مقبول ہوئی کہ چھ سو سال بعد آج بھی ترکی میں مذہبی اجتماعات کے موقع پر ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہے۔

سلطان مُراد دوم (1421ء۔1451ء)

سلطان محمد اوّل کے بعد اُس کا بڑا لڑکا مُراد دوم اٹھارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ نوعمری کے باوجود مراد دوم ایک سمجھ دار اور مضبوط حکمران ثابت ہوا۔ تیموری حملے کے بعد ایشیائے کوچک کی جو ریاستیں (گرمیان' قسطمونی' منتشا' صادوخان اور حمید) آزاد اور خود مختار ہو گئی تھیں' ان کو اُس نے پھر مطیع کیا۔ یورپ میں اُس نے 1430ء میں سالونیکا فتح کیا۔ 1444ء میں وارنا کے مقام پر اور 1448ء میں کسووا کے مقام پر یورپ کی متحدہ صلیبی فوجوں کو شکست فاش دی۔ ان جنگوں کے نتیجے میں سرویا اور بوسنیا کی ریاستیں پوری طرح مطیع کر لی گئیں اور یونان کا جنوبی حصہ جزیرہ نمائے موریا بھی باج گزار بنا لیا گیا۔ مُراد دوم عدل و انصاف اور شریفانہ اوصاف میں اپنے آباء و اجداد سے بھی آگے بڑھ گیا۔ اس کے دشمن بھی اس کی تعریف کرتے تھے۔ وہ جب بھی کوئی ملک فتح کرتا تو سب سے پہلے وہاں مسجدیں' کارواں سرائیں' شفاخانے اور مدرسے تعمیر کراتا۔ ہر سال ایک ہزار اشرفیاں سادات کی نذر کرتا اور ڈھائی ہزار اشرفیاں مکہ معظّمہ' مدینہ منورہ اور بیت المقدس کے دین داروں کے لیے بھیجتا۔

سلطان محمد فاتح (1451ء۔1481ء)

مُراد کے بعد اس کا لڑکا محمد فاتح تخت نشین ہوا۔محمد فاتح اپنے کارناموں کی وجہ سے سب سے بازی لے گیا۔اُس کا سب سے بڑا اور یادگار کارنامہ قسطنطنیہ کی فتح ہے۔ترک فوجوں نے یونان' بلغاریہ' سرویا وغیرہ کے جن ملکوں کو فتح کیا تھا' وہ سب قسطنطنیہ سے آگے ہیں۔قسطنطنیہ کا بازنطینی بادشاہ ترکوں کو خراج دیتا تھا' لیکن شہر پر ابھی تک مسلمانوں کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔قیصر روم کے اس دارالسلطنت پر قبضہ کرنے کی مسلمانوں نے سب سے پہلے امیر معاویہؓ کے زمانے میں کوشش کی تھی۔اس کے بعد عربوں نے' پھر ترکوں نے متعدد بار حملے کیے تھے' لیکن رومیوں کی بہادری یا آپس کے اختلافات کی وجہ سے ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔یہ فخر سلطان محمد فاتح کی قسمت میں لکھا تھا۔محمد فاتح نے یہ شہر چوّن دن کے محاصرے کے بعد 20 جمادی الاول 857ھ/29 مئی 1453ء کو فتح کر لیا' اور اس طرح رومیوں کی گیارہ سو سال پرانی سلطنت ایران کی ساسانی سلطنت کی طرح ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔فتح قسطنطنیہ کے بعد آنحضور ﷺ کی وہ پیشین گوئی پوری ہوگئی' جس میں آپؐ نے فرمایا تھا:

''اللہ نے مجھے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کی کنجیاں دے دی ہیں''۔

ایران کے اکاسرہ کی حکومت کا خلفائے راشدین ہی کے زمانے میں خاتمہ ہوگیا تھا' اور قیصر روم کی حکومت کا خاتمہ محمد فاتح نے کیا۔اس فتح کی وجہ سے تاریخ میں اسے ''فاتح'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کی فتح کے علاوہ اور بھی کئی فتوحات کیں۔سرویا' بوسنیا اور یونان جو اَب تک براہِ راست ترکی کے تحت نہیں تھے' بلکہ خراج دیتے تھے' محمد فاتح نے اُن کو براہِ راست ترکی کا صوبہ بنالیا۔ان کے علاوہ شمال میں کریمیا کا علاقہ اور مشرق میں طرابزوں اور سنوپ کی حکومتوں کو بھی ترکی میں شامل کرلیا۔

بحری بیڑہ

محمد فاتح پہلا عثمانی حکمران ہے جس نے بحری طاقت کو بڑی ترقی دی۔سلطنت عثمانیہ کے دونوں حصوں کے درمیان چونکہ سمندر ہے' اس لیے بحری طاقت کے بغیر سلطنت کو قائم رکھنا بڑا مشکل تھا۔فوجوں کو مشرق سے مغرب یا مغرب سے مشرق کی طرف لانے کے لیے ترکوں کو ہمیشہ وینس اور جنیوا کی عیسائی حکومتوں کے تاجروں سے جہاز حاصل کرنے پڑتے تھے۔محمد فاتح نے اپنا بحری بیڑہ تیار کر کے اس کمی کو دُور کر دیا۔ترکی کے بحری بیڑے نے کئی جزیرے بھی فتح کیے۔کریمیا کا دُور دراز علاقہ بحری فوج نے فتح کیا تھا۔

آخر میں محمد فاتح نے اٹلی پر حملہ کیا تھا۔یہ حملہ بھی بحری فوج نے کیا تھا جس کا سردار کریمیا کا فاتح احمد پاشا تھا۔احمد پاشا نے اٹلی اور اوٹرانٹو فتح کرلیا' لیکن دریں اثنا محمد فاتح کا انتقال ہوگیا اور یہ مہم ناکام ہوگئی۔

محمد فاتح پہلا عثمانی حکمران ہے جس کی شہرت دنیا میں دُور دُور تک پھیل گئی۔ اب تک جو حکمران ہوئے تھے اُن کی سلطنت زیادہ وسیع نہیں تھی۔ عثمان خان کے زمانے میں تو سلطنت کا رقبہ صرف ساڑھے سات ہزار مربع میل تھا' یعنی غرناطہ کی بنی احمر کی حکومت سے بھی نصف۔ یوں سمجھئے جیسے ملتان کی حسین لنگاہ کی حکومت۔ آرخان کے زمانے میں اس کی وسعت اندلس کی اُموی سلطنت کے لگ بھگ ہوگئی تھی' لیکن محمد فاتح کے زمانے میں سلطنت عثمانیہ کی وسعت شیر شاہ سوری کی سلطنت کے برابر ہوگئی تھی اور اس زمانے میں پوری اسلامی دنیا اور یورپ میں اتنی بڑی حکومت کسی کی نہیں تھی۔ ایران کی صفوی حکومت اور ہندوستان کی مغل سلطنت ابھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ ہندوستان میں ماوراء النہر میں تیموری شہزادے آپس میں لڑائیوں میں مصروف تھے۔ صرف مصر و شام کی حکومت ایسی تھی جو سلطنت عثمانیہ کا کچھ مقابلہ کرسکتی تھی۔ محمد فاتح کشمیر کے زین العابدین (1420ء۔1470ء)' گجرات کے محمود بھیگڑہ (1458ء۔1511ء)' سندھ کے جام نظام الدین (1461ء۔1509ء)' مالوہ کے محمود خلجی (1436ء۔1469ء) کا ہم عصر تھا۔ محمود گاواں (متوفی 1481ء) اس زمانے میں بہمنی سلطنت کا وزیراعظم تھا۔

قانون نامہ

محمد فاتح صرف اپنی فتوحات اور توسیعات کی وجہ سے مشہور نہیں ہے' بلکہ نظمِ سلطنت اور اپنی حیرت انگیز قابلیت کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ اس نے پہلی مرتبہ سلطنتِ عثمانیہ کے لیے باقاعدہ قوانین مرتب کیے اور بعد میں موجودہ صدی تک اس کے وضع کردہ قوانین پر عمل ہوتا رہا' لیکن اس نے ایک قانون بڑا خراب بنایا۔ وہ یہ کہ جب کوئی بادشاہ تخت پر بیٹھے تو وہ اپنے بھائیوں کو قتل کرا دے۔ بادشاہت میں ایک بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ باپ کے مرجانے کے بعد سلطنت کے لیے بھائیوں میں لڑائیاں شروع ہوجاتی ہیں اور جو طاقتور نکلتا ہے وہ بادشاہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہزاروں لوگوں کا ناحق خون ہوتا ہے۔ محمد فاتح نے ہزارہا لوگوں کی خون ریزی کو روکنے کے لیے یہ قانون بنایا۔ اس قانون کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ آئندہ سلطنت عثمانیہ کی تاریخ میں شہزادوں کی لڑائیاں ختم ہوگئیں۔ لیکن پھر بھی یہی کہا جائے گا کہ محمد فاتح کا یہ قانون ظالمانہ تھا۔

محمد فاتح علوم وفنون کا بڑا سرپرست تھا۔ اس کے دربار سے تیس شاعروں کو وظیفے ملتے تھے۔ وہ خراسان میں مولانا عبدالرحمٰن جامی کو تحفے بھیجا کرتا تھا۔ اس نے کثرت سے مسجدیں' شفاخانے اور مدرسے قائم کیے۔ محمد فاتح اگرچہ اپنی فتوحات اور انتظامی صلاحیت اور تدبر میں اپنے اجداد سے سبقت لے گیا' لیکن وہ اخلاق و کردار میں آرخان' مراد اوّل اور مُراد دوم کے ہم پلہ نہیں تھا۔ وہ اگرچہ فطرتاً ظالم نہیں تھا' لیکن اس کی طبیعت میں درشتی اور سختی تھی۔ وہ اپنی مخالفت برداشت نہیں کرسکتا تھا اور بڑے بڑے لوگوں کو بغیر کسی تحقیق کے قتل کرا دیتا تھا۔ اگرچہ اس نے ''قانون نامہ'' مرتب کر کے

حکومت اور سرکاری عمّال کو قانون کا پابند بنایا' لیکن اپنی ذات میں وہ ایک جابر اور مطلق العنان حکمران تھا' صلاح ومشورہ کو' جو اس کے اجداد کا اصول تھا' وہ ذرہ برابر اہمیت نہیں دیتا تھا۔

محمد فاتح کے بعد اس کا لڑکا بایزید ثانی (1481ء۔1512ء) تخت نشین ہوا۔ اس نے تیس سال حکومت کی۔

(جاری ہے)